صدائے جرس

و دیگر افسانے

از

مسز عبد القادر والدہ سراج الدین ظفر

مطبوعہ

عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور

ناشر

اُردو بک سٹال لاہور

بار دوم ۱۰۰۰ ستمبر سنہ ۱۹۴۱ء قیمت ۸ عہ

اپنے شوہر

ایم عبدالقادر صاحب مرحوم و مغفور رئیسِ جہلم کے نام

فہرست

عرضِ ناشر

مسنز عبدالقادر اپنے ہیبت ناک اور پُر اسرار افسانوں کی وجہ سے دنیائے ادب میں بہت کافی معروف ہو چکی ہیں۔

آپ کے افسانوں کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ "لاشوں کا شہر اور دیگر افسانے" کا پہلا ایڈیشن صرف ڈیڑھ سال کے اندر ختم ہو گیا اور اب دوسرا ایڈیشن فروخت ہو رہا ہے۔ "صدائے جرس" محترمہ موصوفہ کے تازہ ترین شاہکاروں کا مجموعہ ہے۔

جن لوگوں نے آپ کے افسانوں کا بنظرِ غائر مطالعہ کی

عرضِ ناشر

جانتے ہیں کہ محترمہ کے پیشِ نظر صرف وہی مقصد ہے جو ساز پر انگلیاں رکھتے ہوئے ایک مغنی یا بت بناتے وقت ایک سنگ تراش کے پیشِ نظر ہوتا ہے۔ محترمہ موصوفہ کے افسانے کوئی اصلاحی لائحۂ عمل پیش نہیں کرتے۔ مگر آرٹ کے نکتہ نگاہ سے وہ بالکل مکمل ہیں اور کوئی صاحبِ ذوق اُن سے ذہنی تفریح حاصل کیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہندوستان میں آپ پہلی خاتون ہیں جو پر اسرار اور ہیبتناک افسانے اس خوبی سے لکھتی ہیں۔ کہ اُن میں رنگینی اور عریانی کے فقدان کے باوجود حد درجہ جاذبیت اور تاثیر پائی جاتی ہے۔

محترمہ موصوفہ کا علمی و ادبی ذوق نہایت پاکیزہ اور سلجھا ہوا ہے اور یہ مقامِ مسرت ہے کہ آپ خانگی مشغولیتوں کے باوجود علم و ہنر کے اکتساب کی طرف مائل رہتی ہیں یہ آپ ہی کے ادبی ذوق کا نتیجہ ہے۔ کہ آپ کے فرزند مسٹر سراج الدین ظفر بی۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی، ایک مشتاق شاعر اور ادیب بن کر آسمانِ ادب پر درخشاں ہیں۔

اگر اہلِ نظر حضرات نے حوصلہ افزائی فرمائی۔ تو عنقریب محترمہ موصوفہ کا تیسرا مجموعہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں گا۔

ظہیر

صدائے جرس

ملتان
۲۰ ستمبر ۱۹۳۷ء

خلیل میرا دوست تھا۔ ہماری محبّت کالج بھر میں ضرب المثل تھی۔ ہم دونوں تاریخ قدیم سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ جہاں کہیں اخبارات یا رسائل میں کسی قدیم تہذیب کے متعلق کوئی لٹریچر شائع ہوتا۔ یا پرانے معبدوں اور مقبروں کی کھدائی کا ذکر ہوتا تو ہماری آتش شوق بھڑک اٹھتی۔ یہی شوق ہماری محبت و یکجائی کی اہم ترین وجہ تھا۔

تاریخ عالم میں تاریخ مصر کا باب خصوصاً ہماری توجہات کا مرکز تھا ہم اکثر اوقات قدیم مصریوں کی روحانی طاقت اور دیگر کمالات پر بحث

کیا کرتے جب ہم فراعنۂ مصر کی عجیب و غریب شخصیتوں اور اُن کی آہنی حکومتوں پر تبادلۂ خیالات کرتے تو تصوّر ہمیں ہزار ہا سال پہلے کی دُنیا میں لے جاتا اور کئی کئی گھنٹے ہم اسی خواب و خیال کی دُنیا میں غرق رہتے چنانچہ تعلیم کا زمانہ ہم نے اسی خبط میں بسر کیا۔ لیکن تعلیم کے خاتمہ پر ہمارا یہ شوق ادھورا رہ گیا۔ دنیا کے جھمیلوں نے ہمیں ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا۔ وہ فوج میں ملازم ہوا اور مجھے اپنی زمینداری سنبھالنا پڑی ..... ہم دونوں دس سال تک جدا رہے اسی عرصہ میں میری شادی نسیمہ سے ہو گئی۔ نسیمہ کے نور پاش حُسن اور معصوم محبت نے مجھے ایسا محو کیا کہ میں نے اپنے سب مشاغل ترک کر کے اپنی زندگی کو محبّت کی جولانیوں کے سپرد کر دیا۔

خلیل ابھی تک مجرّد تھا۔ وہ اس وقت تک تقریباً آدھی دُنیا کا چکر لگا چکا تھا۔ اس کے خطوط اکثر آیا کرتے تھے۔ جن میں وہی پہلا سا خلوص بھرا ہوتا .... پورے دس سال کے بعد مجھے اُس کا ایک ایسا خط ملا جس نے میرے پرانے شوق کو از سر نو تازہ کر کے میرے دِل میں جستجو کی ہل چل ڈال دی۔

خط کا مضمون مختصر تھا یعنی وہ ملازمت سے سبکدوش ہو کر کلکتہ میں سکونت پذیر ہے۔ اور مصر کے ایک پرانے مقبرے سے عجائبات کا ایک بہت بڑا خزانہ ساتھ لایا ہے۔ اس نے مجھے دعوت دی تھی کہ میں

کلکتہ جاکر اِن نادر اور عجوبۂ روزگار اشیا کا معائنہ کروں .... اس کے خط سے پھر ایک بار میری آتشِ شوق بھڑک اٹھی۔ دبے ہوئے جذبات دوبارہ اُبھرنے لگے۔ اور دُوسرے دن میں بمع نسیمہ کے کلکتہ روانہ ہو گیا

(۲)

خلیل کا وسیع بنگلہ شہر سے چند میل پرے دریائے ہگلی کے کنارے واقع تھا۔ جس پر ناریل اور زیتون کے درختوں نے اپنا تاریک سایہ ڈال رکھا تھا ...... شام قریب تھی۔ تاجدارِ مشرق ایوانِ مغرب میں داخل ہونے والا تھا۔ ہوا بالکل ساکن تھی۔ اُفق پر خاکستری رنگ کے بادل طوفان کی آمد کا اعلان کر رہے تھے۔ فضا نہایت اداس اور غبار آلود تھی .... بنگلے میں بالکل سناٹا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ اس ویرانے میں کیونکر رہتا ہے۔ بنگلے میں کوئی ملازم بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ چاروں طرف اُجاڑ بیابان نہ آدم نہ آدم زاد۔

ناچار میں بنگلے کا طواف کرنے لگا۔ سب دروازے اندر سے بند تھے میں نے آوازیں دیں۔ دروازے کھٹکھٹائے مگر بے سود۔ اس ناگوار سکوت سے نسیمہ بہت بددل ہوئی اور واپس چلنے پر اصرار کرنے لگی۔

ہم لوگ مایوس ہو کر واپس جانے ہی کو تھے کہ سب سے اوپر والی منزل کی کھڑکی کھلی مگر فوراً ہی بند ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد مقابل والا دروازہ کھُلا اور

ایک شخص نمودار ہوا......... یہ ایک ادھیڑ عمر کا پتلا دبلا مدقوق سا شخص تھا۔ اس کے زرد اور بے رونق چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ اُسکی پھیکی اور بے رس آنکھیں تیزی سے حلقوں میں گردش کر رہی تھیں۔ اُسکے کھردرے اور بدرنگ بالوں پر خشکی کی وجہ سے گرد جمی ہوئی معلوم ہوتی تھی......... اس شخص کو دیکھ کر نسیمہ بہت گھبرائی۔

میں نے حوصلہ کر کے اُس سے خلیل کی بابت پوچھا۔ مگر اُس نے جواب دینے کے عوض نفرت سے ہونٹوں کو سکیڑتے ہوئے دروازہ کھولا اور نہایت بے اعتنائی سے ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر خود چپ چاپ اُوپر والی منزل میں چلا گیا۔

اس کمرے میں قدیم صنعت کی کئی عجیب و غریب اشیاء موجود تھیں۔ لیکن ان میں دو چیزیں نہایت ہی ہولناک تھیں۔ ایک تو سنگِ جراحت کا ایک خوبصورت پیالہ تھا۔ جس کی تہ میں خون کی طرح کوئی سُرخ چیز جمی ہوئی تھی اور دُوسری پتھر کی ایک چھُری تھی جو آدھی سے زیادہ خون آلود تھی۔ نسیمہ ان چیزوں کو دیکھ کر لرزنے لگی۔

میں ابھی ان چیزوں کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ کہ کار کا ہارن سُنائی دیا۔ اور چند منٹ بعد خلیل کمرے میں داخل ہوا وہ اسی طرح خوبصورت اور جوان تھا۔ اُس کی وجاہت اور شکل و صورت پر وقت نے بالکل اثر

نہ کیا تھا۔ وہ اندر داخل ہوتے ہی مجھ سے لپٹ گیا ...... ایک دوسرے کی مزاج پرسی کے بعد میں نے پوچھا۔ "خلیل! یہ بھوت کی قسم کا آدمی دوسری منزل میں کون ہے؟" اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اور تمہارا اشارہ شاید اُس وحشی نوت کی طرف ہے۔ جو آج بدقسمتی سے گھر پر اکیلا تھا۔ کیونکہ میرے تمام ملازم آج شہر میں میلہ دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ اُس نے ضرور تمہیں ستایا ہوگا۔"

اس کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ نسیمہ کو دیکھ کر بہت خوش تھا۔ اسی عرصے میں خلیل کے حکم سے ہمارے لئے دو کمرے تیار ہو گئے جہاں ہم نے آرام کیا۔ میری آنکھ کھلی تو شام کافی گہری ہو چکی تھی۔ خلیل کمرے میں موجود تھا۔ وہیں ہم نے کھانا کھایا اُسکے بعد وہ دیر تک غیر ممالک کے حالات بیان کرتا رہا حتیٰ کہ رات کے بارہ بج گئے۔ ملازمین ایک عرصہ سے اپنی ڈیوٹی ختم کر کے گہری نیند سو چکے تھے۔ تمام دُنیا خاموش تھی۔ گرم اور تاریک رات کے اندھیر کساپوں میں لمبے لمبے ناریل کے درخت جہنمی روحوں کی طرح مایوسی سے سمٹے سمٹائے کھڑے تھے۔ ہر طرف موت کا سا سکوت تھا ...... میں نے خلیل سے آرام کرنے کو کہا۔ وہ کسمساتا ہوا اُٹھا مگر چند قدم آگے چل کر پھر واپس پلٹا۔ اور جھک کر میرے کان میں کہنے لگا۔ "ابھی سونے کا وقت نہیں میں تمہیں ایک عجیب چیز دکھانا چاہتا ہوں۔

ذرا نسیمہ کو سو جانے دو"...... نہ جانے اس نے یہ فقرہ کس طرح سن لیا۔" یہ کبھی نہ ہوگا۔ میں اس سنسان گھر میں ایک لمحہ بھی اکیلی نہ رہوں گی" نسیمہ نے چلا کر کہا...... "لیکن وہ تمہارے دیکھنے کی چیز نہیں" خلیل نے جواب دیا...... مگر تنہا رہ کر تو شاید میں زندہ بھی نہ بچ سکوں گی"۔ نسیمہ نے مچلتے ہوئے کہا۔

یکایک ایک پُر حسرت اور مدھم سا ساز سنائی دیا۔ ہم سب چونک پڑے...... "اوہو وقت بہت ہو گیا ہے۔ وحشی نوت نے اپنی عبادت بھی شروع کر دی"۔ خلیل نے کہا...... اس ساز میں کچھ ایسا ناپاک شیطانی اثر تھا۔ کہ میرا دل دھڑکنے لگا۔ نسیمہ کا چہرہ بھی زرد ہو گیا۔ "اُف یہ ساز کس قدر منحوس ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ کہ جیسے میں وادئ موت میں داخل ہو رہا ہوں کیا تم اسے بند کرا سکتے ہو"۔ میں نے بے چینی سے کہا۔

"یہ تو بہت مشکل ہے"۔ خلیل نے کہا "نوت کو کیسے روکا جائے وہ بہرہ ہونے کے علاوہ اس ساز کے بجانے میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ اُسے تن بدن تک کا ہوش نہیں رہتا...... "ایسے خوفناک آدمی کو برطرف کیوں نہیں کر دیتے"۔ نسیمہ نے کہا۔ "پسند تو اسے میں بھی نہیں کرتا"۔ خلیل نے کہا"۔ لیکن یہ بڑے کام کا آدمی ہے اس کی وساطت سے مجھے چند ایسی عجوبہ اور نادر اشیاء دستیاب ہوتی ہیں۔ جو ایک وحشی قوم کی ملکیت تھیں یہ قوم

صحرا میں غاروں کے اندر رہتی ہے ۔ نوت اسی قوم کا فرد ہے ۔ میں اُسے بمشکل رام کر سکا "......... پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگا " وقت گزر رہا ہے اگر تم لوگ کچھ دیکھنا چاہو تو میں تیار ہوں " .... ہم اٹھ کھڑے ہوئے اور وہ ہمارے آگے آگے چلنے لگا ۔ سب سے اوپر والی منزل پر جا کر اس نے ایک طویل و عریض کمرہ کھولا ۔ اس کمرے میں دروازوں پر بھاری بھاری زرتار پردے لٹک رہے تھے اور اندر نہایت اوداس اور حسرت آمیز بھینی بھینی خوشبو پھیل رہی تھی ۔ خلیل نے احترام کے طور پر جھک کر وزنی زرتار پردہ اٹھایا ۔ اور ہم لوگ اندر داخل ہوئے ۔ کمرے میں زرد وزنی پردوں کے ساتھ جا بجا برقی قمقمے جگمگا رہے تھے ۔ وسط میں دو تابوت پڑے تھے ۔ جن میں ایک سونے کا تھا اور دوسرا پتھر کا ۔

خلیل نے پہلے پتھر کے تابوت سے ڈھکنا اٹھایا ۔ ایک دم ہم سب پر رقت طاری ہو گئی ۔ اس تابوت میں دو خوش رو نوجوان پہلو بہ پہلو لٹائے گئے تھے ۔ یہ حنوط شدہ لاشیں بالکل زندہ معلوم ہوتی تھیں ۔ اُن کے شاندار چہروں پر جنہیں موت کا خونخوار پنجہ بھی نہ بگاڑ سکا تھا ۔ ایک راحت آمیز غم کی جھلک نمایاں تھی ۔ اُن کی لمبی لمبی عبرت آمیز آنکھوں سے بلا کا درد اور انتہائی بے کسی ٹپک رہی تھی .... ان مردہ نوجوانوں کو دیکھ کر میرے دل میں اُن کے لئے ہمدردی اور رحم کا جذبہ تڑپ اُٹھا ۔ ان نوجوانوں کا صرف چہرہ ہی عریاں تھا ۔ باقی تمام جسم روغنی پٹیوں میں لپیٹا گیا تھا ۔ تاہم وہ پٹیاں اُن کے بانکپن پر اثر انداز نہ تھیں ۔ ...

.... "نہ جانے یہ رعنا جوان کس طرح ملک الموت سے مغلوب ہوئے ہوں گے"۔ میں نے دلی رنج سے کہا۔ "ان دونوں کے حالات زندگی ایک درخت کی چھال پہ لکھے ہوئے موجود تھے"۔ خلیل نے کہا۔ "میں نے ایک عالم کے پاس جو مردہ زبانوں کا ماہر ہے۔ بھیج دیئے ہیں۔ تاکہ یہ زمانہ رفتہ کی مٹی ہوئی نشانیاں موجودہ زمانے کے مہذب لوگوں سے متعارف ہو جائیں"۔

اسکے بعد اُس نے سونے کے تابوت سے ڈھکنا اٹھایا۔ اب ایک دلفریب سین میرے پیش نظر تھا۔ تابش حسن سے میری آنکھیں جھک گئیں۔ اُس تابوت میں ایک ایسی نازنین ابدی نیند سو رہی تھی جسے حسن و شباب کی دیوی کہنا بجا تھا۔ حسین ساحرہ جو کبھی آسمان حسن کا چمکتا ہوا ستارہ تھی فنا ہو کر بھی اپنے حسین جلوے بکھیر رہی تھی۔ اس کے خد و خال سے حسن کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ یہ حسینہ پٹیوں کی بجائے قدیم مصری زنانہ لباس میں ملبوس تھی۔ اُس کے سر پہ عقاب نما سنہری تاج تھا۔ جس کے نیچے کاجل گے سے سیاہ بالوں کی لٹیں شعلہ گوں چہرے کے گرد حلقہ بناتی ہوئی اس طرح سینے پر پڑی تھیں جیسے چاند کے گرد کالی گھٹائیں وہ ایک زردوز بستر پر نہایت شان و شوکت سے رکھی گئی تھی۔

خلیل اُسے دیکھتے ہی کھل گیا۔ وہ اس شمع خاموش پر پروانہ وار نثار ہونے لگا۔ اُسے یہ احساس تک نہ رہا کہ یہ حسن و جمال کی پتلی کسی نامعلوم زمانہ سے فرشتۂ اجل سرد آغوش میں سو رہی ہے اُسکی گرم جوشیاں اب اُسے

بیدار نہ کر سکیں گی .... میں دُنیا کی بے ثباتی پر اشکِ حسرت بہاتا ہوا پھر اُن اجل رسیدہ جوانوں کے پاس آ کھڑا ہوا۔ یکایک میری نظر ایک نوجوان کی گردن کے ایسے مقام پر پڑی جہاں سے روغنی پٹی ذرا نیچے کو سرکی ہوئی تھی۔ شاہرگ کے قریب ایک سیاہ داغ دکھائی دیا۔ میں نے پٹی پوری طرح ہٹائی۔ یہ ایک چھری کے زخم کا نشان تھا۔ میرے منہ سے ایک دلدوز آہ نکلی یہ جوان شاید لڑائی میں مارا گیا تھا۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ ناگاہ دوسرے نوجوان کی گردن پر بھی مجھے اسی طرح کا ایک سیاہ داغ نظر آیا .... میں کانپ اٹھا اور خیال کرنے لگا۔ کہ شاید دونوں مجرم تھے۔ جو اُس زمانہ کے قانون کے مطابق ہلاک کئے گئے۔ مگر اُنکے چہروں پر ایک ملکوتی نور برس رہا تھا۔ وہ مظلوم معلوم ہوتے تھے۔ خلیل ابھی تک اُس حسینہ کی لاش کے قریب کھڑا تھا۔ اُسکی حالت اب ایک افسوسناک حد تک پہنچ چکی تھی۔ وہ لاش سے اظہار محبت کر رہا تھا۔

خلیل یہ کیا پاگل پن ہے ہوش میں آؤ۔ کیا تم نہیں جانتے کہ تم ایک لاش سے اظہارِ محبّت کر رہے ہو"۔ میں نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ....

"ممتاز اسے مردہ کہہ کر میرا دل نہ دکھاؤ۔ یہ زندہ ہے اور اپنی خاموش آنکھوں سے میری محبّت کا جواب دے رہی ہے"۔ خلیل نے اُسی مجنونانہ انداز سے کہا۔

"آہ! ایسا سحر کار حسن کسی کو نہیں ملا۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ آؤ تم بھی

اس کی محبت کا اقرار کر دو۔" میں متوحش نگاہوں سے اس حسینہ کی لاش کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اُسکی آنکھیں مجھے اپنے اندر جذب کر رہی ہیں "ہاں میں بھی اس سے محبت کرتا ہوں۔" میں نے کسی نامعلوم جذبہ سے مجبور ہو کر کہا۔ عین اُسی وقت مجھے اپنے قریب ایک ٹھنڈا سا سانس سنائی دیا۔ میں نے چونک کر دیکھا تو نسیمہ میرے پہلو میں سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ میں نے کندھوں کو جھٹک کر اپنے حواس درست کئے۔

تم بھی اس سے محبت کرتے ہو" خلیل نے وفورِ مسرت سے کہا۔ "نہیں میرے پاس اس سے بہتر چیز موجود ہے" میں نے بلند آواز میں کہا اور نسیمہ کا ہاتھ پکڑ کر جلدی اس کمرے سے باہر نکل آیا۔

رات ہم نے انتہائی اضطراب میں بسر کی خلیل کی بابت کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ اس لاش کے پاس رہا۔ یا اپنے کمرے میں صبح کے اُجالے میں ہماری حالت قدرے سکون پذیر ہوئی۔ .... جتنی جلدی ہو سکے ہمیں یہاں سے چل دینا چاہیئے۔" نسیمہ نے کہا۔ "اتنی جلدی تو خلیل کبھی جانے نہ دے گا" میں نے جواب دیا۔ "ہم اُسکی اجازت کی ضرورت نہیں" نسیمہ نے کہا "ہمارا یہاں رہنا سخت خطرناک ہے" .... اگر تم اس لاش سے ڈرتی ہو تو میں بھی اس سے نفرت کرتا ہوں" میں نے کہا "اب پھر کبھی اسے نہ دیکھوں گا۔ خاطر جمع رکھو" .... اگر تم وہاں نہ جاؤ گے تو وہ خود یہاں آ جائے گی" نسیمہ نے

کہا۔" کیا خوب لاش یہاں آ جائے گی"۔ میں نے ہنس کر جواب دیا۔ ......

"وہ مردہ نہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اُسے زندہ دیکھا ہے نسیمہ نے بیقرار ہو کر کہا۔" یہ تمہارا وہم ہے"۔ میں نے کہا"ہرگز نہیں"۔ اُس نے کہا" جس وقت خلیل اُس سے اظہارِ محبت کر رہا تھا۔ تم نے دھیان نہیں کیا۔ اُسکے لبوں پر ایک فاتحانہ تبسّم کھیل رہا تھا۔ پھر جب خلیل اُسکی تعریف کر رہا تھا۔ اُسوقت بھی اسکی آنکھوں میں زندگی کے آثار موجود تھے۔ چنانچہ اس نے اپنی مخمور آنکھوں سے تمہیں بھی محبت کا پیغام دیا۔ اور تم بھی مجبوراً اُسکی محبت کا اعتراف کرنے لگے"۔ میں ڈر گیا۔ رات والی کیفیت مجھے یاد آ گئی ......

... نسیمہ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔" شاید تم نے نہ دیکھا ہو۔ جب تم نے اس کے مقابلے میں مجھے بہترین قرار دیا تو فوراً اسکی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اور جب ہم باہر نکل رہے تھے۔ تو میں نے پلٹ کر دیکھا تو اس کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔ وہ غضبناک نگاہوں سے گھور گھور کر ہمیں دیکھ رہی تھی"۔

میں نے اسکا وہم دُور کرنیکی بہت کوشش کی۔ مگر وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔ اِتنے میں خلیل بھی آ گیا۔ اُسکی خمار آلود آنکھوں سے صاف ظاہر تھا۔ کہ وہ رات بھر جاگتا رہا ہے۔ میں نے نسیمہ کی علالت کا بہانہ کرتے ہوئے اُس سے واپسی کی اجازت چاہی اور آخرکار اسکی انتہائی مخالفت اور ناراضگی کے باوجود ہم لوگ وہاں سے چلے آئے۔

(۳)

کلکتہ سے آئے ہمیں آٹھ مہینے گزر چکے تھے۔ کہ اچانک خلیل کی موت کا تار ملا۔ یہ تار اسکے قانونی مشیر اُپدیش چندر کی طرف سے تھا۔ خلیل نے اپنا بنگلہ وغیرہ میرے نام چھوڑا تھا۔ ...... خلیل کی موت سے مجھے بیحد صدمہ ہؤا۔ اور اسی دن کلکتہ چلا گیا۔

اُس کا بنگلہ دیکھ کر میرے رنج وغم میں مزید اضافہ ہؤا۔ بنگلے پر پہلے سے بھی زیادہ دلشکن نحوست چھا رہی تھی۔ ایک بھیانک افسردگی اور دلگیر اُداسی در و دیوار سے ہویدا تھی۔ میں متوفی کے کمرے میں گیا۔ جہاں چند ملازم اور ایک بوڑھا مولوی موجود تھا۔ جسے تجہیز و تکفین کی آخری رسومات ادا کرنی تھیں۔ ...... کفن کا بند کھولا گیا۔ اُسکی لاش کو دیکھ کر میرے دل پر سخت چوٹ لگی۔ موت سے ہم آغوش ہوکر اُس کا حسن بجائے پژمردہ ہونے کے نکھر گیا تھا۔ اسکے نقش اتنے دلکش اور تیکھے ہو رہے تھے۔ کہ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کسی دیوتا کی مورتی تراش کر کفن میں رکھی گئی ہے مگر جس چیز نے مجھے زیادہ متوجہ کیا وہ ایسی علامات تھیں جو اُن حنوط شدہ نوجوانوں کے بشرے سے پائی جاتی تھیں جنہیں گذشتہ سال میں اسی بنگلہ میں دیکھ چکا تھا۔ اُنہیں کی طرح اس کی نیم وا آنکھوں سے بھی بیکسی ظاہر ہوتی تھی۔ اُسکے نمکین چہرے پر بھی وہی مظلومی کی جھلک اور کافوری پیشانی پر حُزن و ملال کے آثار تھے۔ اُسکے کاغذی لبوں پر

ایسا دردناک ختم تھا۔ گویا وہ ابھی افسانۂ غم سنایا ہی چاہتا ہے...... ملازم نے اسی دم اُسکی گردن سے کفن سرکایا۔ آہ میں دھک سے رہ گیا۔ اُسکی گردن پر بھی ویسا ہی چھری کا زخم موجود تھا......... پولیس کی تحقیقات ختم ہو چکی تھی۔ اُس کی موت کو خودکشی قرار دیا گیا۔ جو اُس نے پتھر کی چھری سے کی تھی۔ یہ وہی چھری تھی جو پچھلے سال میں خلیل کے ڈرائنگ روم میں دیکھ چکا تھا۔ گو یہ پہلے بھی خون آلود تھی۔ مگر اب خون بالکل تازہ معلوم ہوتا تھا۔ اس چھری کو دیکھ کر مجھے سنگِ جراحت کا وہ پیالہ بھی یاد آ گیا۔ جو پچھلے سال میں نے اس چھُری کے قریب پڑا دیکھا تھا۔ میں اُسی وقت ڈرائنگ روم میں گیا اور پیالے کو دیکھا۔ تو اس کی تہ میں جمی ہوئی سُرخی بھی اب تازہ تھی۔ لوگ اسکی موت کو خودکشی کہیں مگر میں اسے خودکشی کہنے کے لئے تیار نہ تھا۔

اسی ضمن میں میری ملاقات ڈاکٹر رمل بابو سے ہوئی۔ جس سے خلیل عموماً طبی مشورہ لیا کرتا تھا۔ دورانِ گفتگو میں اُس نے کہا "خودکشی سے دو ماہ پیشتر خلیل سخت بیمار رہا۔ اور تشخیص سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس پر کسی دہشت کا اثر ہے۔ وہ مجھے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ سکتا تھا۔ آخرکار ایک دن اُس نے حوصلہ کر کے کہہ ہی دیا۔ کہ رمل بابو میرے پاس ایک مصری عورت کی حنوط شدہ لاش ہے۔ جس سے میں سخت خوفزدہ ہوں۔ اور اس سے بچنا چاہتا ہوں۔ مگر کوئی غیر مرئی قوت مجھے زبردستی اسکی طرف کھینچ لے جاتی ہے اور یہی میری بیماری

کچھ دن بعد جب وہ پھر خواب میں ڈر گئی تو مجھے بہت تشویش ہوئی۔ اس دفعہ وہ انتہائی خوفزدہ تھی۔ اُسے خواب میں اُس مصری حسینہ کی لاش بھی دکھائی دی۔ اس خواب کا اُس پر ایسا بُرا اثر ہوا کہ وہ بیمار رہنے لگی۔ اور روز بروز اس کی صحت گرتی گئی۔ اس عرصہ میں میں نے اس کے علاج میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔

خوش قسمتی سے انہی دنوں مسٹر سعید جو میرا قریبی رشتہ دار تھا۔ ولایت سے ڈاکٹری پاس کر کے آیا۔ اُس نے نسیمہ کا معائنہ کر کے بتایا کہ کوئی زہریلی خوراک کھانے سے اُسکی صحت خراب ہو رہی ہے۔ چنانچہ وہ بہت تندہی سے اس کا علاج کرتا رہا۔ اُسے کئی قسم کے باتھ اور انجکشن دئے گئے۔ رنگین شعاعوں کا عمل بھی ہوتا رہا۔ پھر بھی وہ صحت یاب نہ ہو سکی .... ایک دن سعید نے مجھے ہدایت کی۔ کہ اسکی خوراک وغیرہ کا خاص خیال رکھوں۔ اس کا خیال تھا کہ ابھی تک تھوڑی تھوڑی مقدار میں زہر اُس کے اندر جا رہا ہے۔ جب اس احتیاط کے باوجود بھی آفاقہ کی صورت دکھائی نہ دی۔ تو اس نے مایوس ہو کر کہا۔ "ممتاز میں تمہیں زیادہ دیر لاعلمی میں رکھنا نہیں چاہتا۔ نسیمہ کی زندگی خطرے میں ہے۔ اُسے برابر زہر دیا جا رہا ہے۔ اور میں نہیں جانتا کہ یہ عجیب قسم کا زہر ہندوستان میں کیسے آیا۔ کیونکہ یہ زہر مصری چھپکلی کے پتے سے نکلتا ہے یہ انسان کو یکدم ہلاک نہیں کرتا۔ بلکہ آہستہ آہستہ اپنا کام کرتا ہے۔" ......

... سعید کے منہ سے یہ الفاظ سن کر میں دہل گیا۔ میں نے خلیل کی موت اور حنوط شدہ لاش کی شیطانی قوت کا سب واقعہ اس کے گوش گذار کر دیا۔" میں نہیں کہہ سکتا۔ ان واقعات میں کہاں تک صداقت ہے" سعید نے کہا۔ "تاہم میں یہ ضرور مشورہ دوں گا کہ نسیمہ کو مصر لے جاؤ۔ وہاں کے ڈاکٹر ضرور اس زہر کا تریاق جانتے ہوں گے۔ شاید وہ اسے اچھا کر سکیں"۔

سعید کی گفتگو سے صاف ظاہر تھا کہ نسیمہ کا مرض لاعلاج ہے۔ میں بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ سعید نے مجھے تسلی دی۔ اور اپنی ہمدردانہ باتوں سے میرا حوصلہ بڑھایا۔ دنیا یا امید قائم ہے میں آخری بار قسمت آزمائی کرنے کو تیار ہو گیا۔........ اس مصیبت میں سعید نے میری بہت مدد کی اُس نے اپنے ایک مصری دوست عمر آفندی کے نام (جس نے اُس کے ساتھ ہی ڈاکٹری پاس کی تھی۔) چھٹی لکھی، کہ میرا ایک عزیز اپنی بیوی کے علاج کے لئے مصر آ رہا ہے اس کی امداد میں کوتاہی نہ کی جائے۔ چنانچہ اسی مہینہ کے آخیر میں ہم لوگ اپنے وطن سے روانہ ہو گئے۔

(۴)

عمر آفندی نہایت نیک دل۔ مہمان نواز مشفق دوست ثابت ہوا۔ اُس نے ہماری تنہائی اور غریب الوطنی کا خیال کرتے ہوئے نہ صرف اپنی کوٹھی کے ایک حصے میں کچھ کمرے دے رکھے تھے۔ بلکہ اس کی نیک نفسی نے یہ بھی گوارا نہ

نہ کیا کہ ہم کھانے کا انتظام ہی علیحدہ کریں اُس کی خوش اخلاقی اور خلوص نے ہمیں گرویدہ کر لیا۔.......... مصر کی معتدل آب و ہوا اور عمر آفندی کی قابلِ قدر کوششوں سے نسیمہ تین مہینے کے اندر اندر تندرست ہو گئی مگر عمر آفندی کی ہدایت کے مطابق ابھی کچھ عرصہ ہمیں یہاں اور ٹھہرنا تھا۔

انہی ایام میں یکایک مجھے ایک عجیب عارضہ لاحق ہو گیا یعنی رات کو نیند مجھ سے کوسوں دُور ہو جاتی اور میں بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہتا۔ میں اکثر خیال کرنے لگتا۔ شاید میری کوئی چیز گم ہو گئی ہے۔ میں اس چیز کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مگر معلوم نہ تھا وہ چیز کیا ہے۔

ایک دن آدھی رات کو ایک ناقہ سڑک پر گذری اس کے گلے کی گھنٹیوں کی صدا مجھے اس قدر پیاری معلوم ہوئی کہ میں نے محسوس کیا۔ میں اسی چیز کی تلاش میں تھا۔ وہ آواز مجھے اپنے اندر جذب کرنے لگی۔ میں نے ارادہ کیا کہ اس ساربان کے ساتھ کہیں چلا جاؤں۔ اس دن سے روزانہ وہ ناقہ آدھی رات کو سڑک پر سے گذرنے لگی۔ میں گھنٹوں اس آواز کا منتظر رہتا۔ جونہی وہ سہانی صدا میرے کان میں پڑتی۔ میں ایک مسرت آگیں خواب میں مسحور ہو جاتا۔ رفتہ رفتہ یہ صدا میری زندگی کا جزو بن گئی اور نہ جانے کس طرح میں نے ساربان سے دوستی بھی پیدا کر لی۔ اُس گھنٹی کی صدا سنتے ہی میں فوراً سڑک پر پہنچ جاتا۔ اور اس سے باتیں کیا کرتا۔ اسکی باتیں کچھ ایسی دلکش اور پیاری تھیں کہ میرا دل

مسرت سے لبریز ہو جاتا اور میری روح ایک لذت انگیز نشہ میں سرشار ہو جاتی۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ وہ کس قسم کی باتیں ہوتیں۔ جن سے میں اتنا مسرور ہوتا۔ کیونکہ اُسکے جانے کے بعد مجھے وہ باتیں ایک بھولا ہوا خواب معلوم ہوتی تھیں۔ میں اسکے ساتھ کسی نامعلوم اور پُرسکون دُنیا میں جانا چاہتا تھا۔ مگر اُسے دیکھکر میری زبان پر مہر لگ جاتی۔ اور اعضاء بے حس و حرکت ہو جاتے میں اُس پر اپنی دلی کیفیت کا اظہار نہ کر سکتا تھا جب وہ آگے بڑھ جاتا تو میں ناقہ کے نقش پا پر وحشیانہ انداز سے دوڑنے لگتا۔ اور تھک جانے پر جب اس مسحور کن رنگین خواب سے ہوشیار ہوتا۔ تو میری بہت بُری حالت ہوتی۔ ساربان کی پر حلاوت باتوں سے میرا دل ایسا مسخر ہوا۔ کہ مجھے دنیا کی کسی چیز سے دلچسپی نہ رہی۔ میں نسیمہ کو اب بھی خوش رکھنے کی کوشش کرتا۔ مگر مجبوراً۔ عمر آفندی سے اب بھی میرے دوستانہ تعلقات تھے۔ مگر خالی از خلوص عمر آفندی نے میری اس کیفیت کو خاص طور پر محسوس کیا۔ وہ مجھے پہروں ٹکٹکی باندھے گھورا کرتا اور میرے حرکات و سکنات کی سختی سے نگرانی کرتا۔ آخر کار اُس نے میرے سحر زدہ انقلاب کا خوگر ہو کر میرا خیال بالکل چھوڑ دیا۔ عمر آفندی کو اُن دنوں گھوڑوں کا خبط سما رہا تھا۔ اُس نے کئی اعلےٰ نسل کے گھوڑے خریدے۔ جنمیں ایک عربی نسل کا سبک خرام اور شاندار گھوڑا عوف نامی اُسے بہت محبوب تھا۔ نسیمہ بھی اُس کے اس شغل میں شامل تھی۔ وہ اُن گھوڑوں کی

دیکھ بھال میں گہری دلچسپی لینی۔ موسم خزاں کی مضطرب راتیں اور قمری مہینے کی سترھویں تاریخ تھی۔ زوال پذیر چاند کے رُخ روشن پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں فلک نشین اور درخشاں ستاروں کا رنگ فق ہو رہا تھا۔ چاندنی کسی حسین بیوہ کی طرح سوگوار تھی۔ اس اداس چاندنی کے سائے میں تمام صحرا کفن پوش دکھائی دیتا تھا۔ ٹھنڈی ریت کے پامال شدہ ذرّات سے پراگندہ فضا میں پریشان ہوا کے سنسناتے ہوئے جھونکوں کے ساتھ ارواح خبیثہ کے ماتمی نغمے گونج رہے تھے۔ دریائے نیل کی بدمست لہریں نہایت انتشار کے ساتھ ہر ایک کے سامنے تاریخ مصر کو دہراتی ہوئی رواں دواں تھیں۔

آج میں بہت بیتاب تھا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ اپنے صحرائی دوست سے التجا کروں گا۔ کہ وہ مجھے اس عزلت کدہ سے نکال کر کسی دلآویز فردوسی دنیا میں لے جائے۔

وقت مقررہ پر جب ناقہ کی گھنٹیوں کی سُریلی صدا میرے کانوں میں پڑی تو میں دیوانہ وار باہر نکل آیا۔ نہ جانے میرے دل میں کیا آرزو تھی۔ میں اس سے کیا کہنے والا تھا۔ مگر اُسے دیکھ کر میری زبان بند ہو گئی۔ میں نے بے اختیار بازو پھیلا دئے۔ وہ ایک لمحہ کے لئے رُکا پھر اُس نے ایک چھوٹی سی رسی کی سیڑھی میری طرف پھینکی اور میں بے تابی سے ناقہ پر سوار ہو گیا۔

میں ایک سرور کی حالت میں کجاوے پر بیٹھا تھا۔ گھنٹیوں کی ترنم ریز صدا

میرے سازِ دل کی تاروں کو چھیڑ رہی تھی۔ میں خوشبوؤں کی لامحدود اور نشاندار لہروں میں سمارہا تھا اور ناقہ برق رفتاری سے چل رہی تھی۔

نہ جانے ناقہ کب تک یونہی چلتی رہی۔ یکایک ایک بڑے گھنٹے کی آواز دور سے سنائی دینے لگی جسے سنتے ہی میں اچھل پڑا۔ میری روح سمٹ کر آنکھوں میں آگئی اور سینے میں جذبات کا طوفان اُمڈنے لگا۔ میں اس جگہ جانے کے لئے بیتاب ہوگیا۔ جہاں سے وہ دلنواز اور اچھوتی صدا بلند ہو رہی تھی۔...... ناقہ اب چھوٹی چھوٹی گھاٹیوں کو عبور کر کے ایک عظیم الشان وادی میں داخل ہونے والی تھی۔ کہیں دور جھلملاتی ہوئی برقی روشنی میں فلک شکوہ اہرام کی چوٹیاں دکھائی دے رہی تھی۔

ناقہ یکدم گھاٹی کے نیچے ایک شگاف کے سامنے رک گئی۔ یہاں چار آدمی ہاتھوں میں مشعلیں لئے ہمارے منتظر تھے۔ میں اسی بیتابی سے نیچے اُترا یہ شگاف دراصل ایک غار تھا۔ میں اُن لوگوں کے ہمراہ اُسمیں داخل ہوا۔ مگر اندر قدم رکھتے ہی گھنٹے کی صدا بند ہوگئی۔ اور یکلخت اس سحر زدہ مدہوشی سے بیدار ہو کر میں نے گردوپیش کے مناظر پر نظر ڈالی "شاید میرا صحرائی دوست مجھے کسی خفیہ خزانے کا راز بتانے والا ہے!" میں نے دل میں کہا غار میں ایک لمبا اور نیچا راستہ تھا۔ جس کے ذریعے ہم کسی تہ خانہ میں اُتر رہے تھے۔ حتیٰ کہ غار کے اختتام پر پہنچکر ہم رُک گئے۔ یہ جگہ اتنی تاریک تھی۔ کہ مشعل کی روشنی

بھی کام نہ دے سکتی تھی۔ میں نے چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی مگر کچھ دکھائی نہ دیا۔ یہاں کسی نامعلوم جگہ سے ایک مدھم سے ساز کی آواز آ رہی تھی۔ یہ ساز بالکل ویسا تھا۔ جیسا کہ خلیل کے گھر میں نوبت بجایا کرتا تھا۔ اس آواز سے مجھ پر دہشت طاری ہوگئی۔ اور کسی نامعلوم خطرے کا احساس ہونے لگا۔ مگر میں وحشیوں کے نرغے میں تھا۔ بچاؤ کی صورت ہی نہ تھی۔

یکلخت اندھیرے میں ایک چور دروازہ کھلا۔ وہ لوگ مجھے ایک فراخ وآراستہ کمرے میں لے گئے۔ جو روغن زیتون کے چراغوں سے جگمگا رہا تھا کمرے میں چاروں طرف شہ نشین بنے تھے۔ جن پر کئی تابوت قرینے سے رکھے گئے تھے۔ جا بجا طلائی و نقرئی انگیٹھیوں میں چندن اور عود سلگ رہا تھا...... کمرے کے وسط میں الاؤ کے گرد بیس بائیس غیر مہذب صحرائی کسی خاص زبان میں کوئی منتر گا رہے تھے۔ اور ان میں ایک آدمی کسی انوکھی طرز کا ساز بجا رہا تھا ساز بجانے والے کو میں نے فوراً پہچان لیا وہ نوبت تھا۔

مجھے دیکھتے ہی سب نے ایک بلند نعرہ لگایا۔ صحرائی مجھے شہ نشین پر لے گیا جہاں سونے کی ایک چوکی رکھی تھی جو عقاب کی مورتی کے پروں پر بنائی گئی تھی مجھے اس پر بٹھا دیا گیا۔ اور ایک شخص نے کوئی نہایت خوشبودار سفوف میرے بدن پر ملنا شروع کیا۔ جس کے بعد مجھے چند بہت وزنی طلائی زیور پہنائے گئے پھر ایک طلائی مکٹ میرے سر پر رکھا گیا جو سانپ کی شکل کا بنا ہوا تھا......

غرضیکہ مجھے کسی قدیم شاہانہ طریقے سے سجایا گیا۔ بعدازاں سب نے مل کر کسی خاص زبان میں خاص طریقے سے میری پوجا کی ...... پوجا کے بعد وہ سب دوبارہ الاؤ کے قریب جا کر اپنی مذہبی عبادت میں مصروف ہو گئے۔ نوت شہ نشین کے نیچے میرے پاؤں کے قریب بیٹھ کر اس منحوس ساز کو پوری قوت سے بجانے لگا۔ اور صحرائی نے قریب رکھے ہوئے ایک تابوت کا ڈھکنا اٹھایا۔

تابوت میں رکھی ہوئی کسی لاش کے دونوں ہاتھ اوپر کو اٹھے اور پھر آہستہ آہستہ وہ لاش انگڑائیاں لیتی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی .... لاش کو دیکھ کر میرا رہا سہا خون بھی خشک ہو گیا۔ کیونکہ یہ لاش اسی پراسرار حسینہ کی تھی۔ جسے میں خلیل کے گھر دیکھ چکا تھا۔ اب وہ حیرت انگیز طور پر زندہ تھی۔ وہ ایک شاہانہ تمکنت کے ساتھ تابوت سے باہر نکلی اور عجیب ناز و انداز سے خراماں خراماں میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

میں انتہائی وحشت سے چیخنے لگا "کمبخت! ڈرتا کیوں ہے؟" صحرائی نے حقارت سے کہا "ایسی باعزت موت تو کسی خوش قسمت کو ہی میسر ہوتی ہے۔"

نوت نے کہا "وقت زیادہ ہو گیا ہے۔ اس کے سامنے دیوی کا مقدس عہد دوہرا کر یہ رسم جلدی ادا کر دینی چاہیے۔"

صحرائی لاش کے پاس باادب کھڑا ہو کر کہنے لگا "سن اے ہندی آج سے کئی ہزار سال پیشتر فراعنۂ مصر میں سے ہاہرپ نامی ایک جلیل القدر بادشاہ

تھا۔ جو اپنے عقیدے کا پکا اور مذہب کا زبردست حامی تھا۔ اسکی ایک حسین اور عالی وقار بیٹی تھی جسے وہ بہت چاہتا تھا...... شہزادی کا نام مرسیتار تھا۔ اُسکے حسن کا نام ملک میں شہرہ تھا کئی عالی مرتبت شہزادے اور والیان ملک اُسکے خواہاں تھے۔ سینکڑوں بہادر اور رنگیلے درباری اسکی محبت میں دیوانے ہوئے تھے۔ ہر نوجوان کے سر میں اُسکا سودا تھا۔ مگر شہزادی کا نظریہ دنیا سے مختلف تھا۔ وہ مردوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی اور خصوصاً عشاق کے ساتھ نہایت حقارت آمیز سلوک کرتی۔ وہ عابدہ اور زاہدہ ہونے کے علاوہ اپنے باپ کی طرح مذہب کی دلدادہ تھی۔ اسی مذہبی دیوانگی کی وجہ سے وہ سولہ سال کی عمر میں خدائے رع کے معبد میں راہبہ بن گئی اُس نے اپنے مذہبی طریقے پر قسم اٹھا کر اعلان کر دیا۔ کہ اب وہ مذہبیاً و اخلاقاً کسی مرد کی نہیں ہو سکتی...... دو سال کے اندر اندر اس نے اتنی روحانی ترقی کی کہ اس کی عظمت کا سکہ عوام الناس کے دلوں پر بیٹھ گیا۔ اُسکی زبان میں ایسی تاثیر پیدا ہو گئی کہ جو کچھ وہ زبان سے کہتی پورا ہو جاتا یعنی اُسے ایک دیوی کا رتبہ حاصل ہو گیا!

لیکن جب وہ اس منزل میں تھی۔ تو خدائے رع نے اُس سے ایک کڑی آزمائش چاہی اُسے ایک ایسا غیر متوقع معاملہ پیش آیا کہ اسکے ارادے متزلزل ہو گئے۔ اس کو صحیح راستہ سے بہکانے والا انار مر تھا۔ یہ نوجوان خدائے رع کے عقیدتمندوں میں سے تھا۔ جو تھوڑے ہی دنوں سے معبد میں وارد ہوا تھا۔"

نادر خوبصورتی اور بانکپن کی زندہ مثال تھا۔ اسکی آواز میں مٹھاس تھی جب وہ خدائے رع کی بارگاہ میں اسکی عظمت کے گیت خلوص دلی اور خوش گلوئی سے گاتا۔ تو مرستار کے دل پر اس کا خاص اثر ہوتا محبت و مسرت سے معمور نغمے اسکی رُوح کی لطافتوں سے ہمکنار ہوتے اور کسی نامعلوم جذبے سے اُسکا دِل دھڑکنے لگتا!!

رفتہ رفتہ مرستار کو معلوم ہونے لگا کہ وہ اپنا مقدس دل نادر کی نذر کر چکی ہے وہ اکثر عشق و محبت کے رنگین اور شیریں خوابوں میں مدہوش رہنے لگی۔ اور اسکا دِل گناہ کی آلودگیوں سے ملوّث ہونے لگا۔ گو اُس نے نادر سے بچنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن اسکے خوش نما پیکر میں کچھ ایسی کشش تھی جس کے آگے شہزادی مرستار جیسی مستقل مزاج اور غیور عورت کو جھکنا پڑا۔ اس نے اپنی قسم توڑ کر اپنے آپ کو نادر کے حوالے کر دیا۔

"شہزادی کا یہ ناجائز عشق کچھ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ نادر اُسے چھوڑ کر کسی دوسرے شکار کی تلاش میں پھرنے لگا۔ مرستار کو اپنی ناکامی کا سخت صدمہ ہوا۔ اُس نے دوبارہ خدائے رع کی بارگاہ ناز میں پناہ لینا چاہی۔ مگر اب وہ معتوب تھی۔ خدائے رع کے مذہبی قانون کے مطابق اُسے اپنے محبوب کا خون پینا ضروری تھا۔ چنانچہ وہ ایک دن کسی طریقے سے اپنے بے وفا عاشق کو معبد میں لائی۔ اور اسکی شاہرگ کا خون نکال کر پیا........ اس قربانی

سے اُسے پھر دیوی کا رتبہ مل گیا۔ لیکن ناہعر کی موت نے اُس کا دِل توڑ دیا۔
اور اُس نے اپنا دل بہلانے کی خاطر یہ طریقہ اختیار کیا۔ کہ ہر سال وہ ایک نیا
عاشق تلاش کرتی اور کچھ عرصہ عشق بازی کر کے پھر تارمر کی طرح اس کا خون پی
کر خدائے رع کی خوشنودی حاصل کر لیتی۔......... ان متعدد قربانیوں سے
خدائے رع اُس پر بہت مہربان ہوا۔ شہزادی کا روحانی اقتدار اتنا بڑھا کہ
اس کی بھی پرستش ہونے لگی۔ چنانچہ اس نے اظہارِ شکریہ کے طور پر خدائے
رع کے حضور میں وعدہ کیا کہ وہ ایسی قربانیاں ہمیشہ کیا کریگی۔ اور اُس نے
اپنی زندگی میں اس عہد کی پابندی سختی سے جاری رکھی۔ ہمارے بزرگانِ سلف
اس دیوی کے پجاری تھے۔......... بتیس سال کی عمر میں جب وہ سفرِ آخرت
کرنے لگی۔ تو اس نے اپنے بڑے پجاری کو ایک ایسا طریقہ سکھایا جس کے ذریعہ
وہ بعد مرگ بھی عشاق کی قربانی کا یہ سلسلہ جاری رکھ سکتی تھی۔ غرضیکہ وہ اس
خاص طریقے سے مر کر بھی خوش رہ نوجوانوں سے محبت کر کے اُن کا خون پیتی
رہی۔...... اس زمانے کو صدیاں گذر گئیں۔

ملک میں کتنے انقلاب ہوئے کئی نئے نئے مذہب دنیا میں آئے رفتہ رفتہ
لوگوں کے عقیدے کمزور ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ خدائے رع کا دین اس دنیا سے
بالکل نابود ہو گیا۔ اور یہ معبد جو اس دیوی کی آخری آرام گاہ تھا لوگوں کی نظروں
سے روپوش ہو گیا اور اس زمانہ کی سبھی باتیں صرف روایتیں بن کر رہ گئیں۔

امتدادِ زمانہ سے پجاریوں کا اقتدار خاک میں مل گیا۔ ہمارے بزرگانِ سلف مفلسی میں مبتلا ہو کر خانہ بدوشی پر مجبور ہو گئے اگرچہ اس عرصہ دراز کی صحرائی زندگی نے انہیں بالکل وحشی بنا دیا۔ میرا باپ نوت بچپن ہی سے اپنے بزرگوں کے قدیم مذہب کی طرف راغب تھا۔ وہ اُن خداؤں کی پرستش کیا کرتا جن کے نام وہ کبھی اپنی بڑی بوڑھیوں سے سن چکا تھا۔ .... اس پرانے عقیدے کی برکت سے میرے باپ کو عالم رویا میں اس دیوی کی زیارت ہوئی۔ اُس نے اُسے اپنی آخری آرامگاہ کا پتہ دے کر اپنے مقدس عہد سے بھی آگاہ کیا۔ اور وعدہ کیا کہ اگر وہ یا اسکی قوم اُسکے بتلائے ہوئے طریقے سے قربانی کا سلسلہ دوبارہ قائم کریگی۔ تو وہ لوگ خوشحال ہو جائیں گے۔ عہد گذشتہ کی اور بھی کئی باتیں میرے باپ کو الہامی طریقے

....

.... پر معلوم ہوئیں۔ اسطرح

میرے باپ نے اس معبد کا کھوج تو لگا لیا لیکن قربانی کے واسطے نوجوانوں کو مہیا کرنا سخت خطرناک تھا۔ کیونکہ اس طرح حکومت اس معبد کے ظہور سے مطلع ہو کر اسے اپنے قبضے میں لے سکتی تھی۔ اس لئے انتہائی سوچ بچار کے بعد میرے باپ نے نوجوان سیاحوں کو پھانسنے کا فیصلہ کیا۔ اور دیوی کے حضور میں کامیابی کی دعا مانگی۔ اُسی رات پھر میرے باپ کو الہام ہوا۔ اور دیوی نے اُسے ایک خاص منتر بتایا۔ سو جب کبھی میرا باپ کسی سیاح کو قربانی کے واسطے منتخب کرتا

تو راتوں کو اس معبد میں اسکی صورت کا تصور کر کے دیوی کے بتلائے ہوئے منتر کا ورد کرتا۔ جس کے اثر سے سیاح کا دل اُس ناقہ کی گھنٹیوں سے تسخیر ہو جاتا جو ہیں اسی غرض سے اُس طرف لے جایا کرتا تھا۔ اور وہ ایک دن اسی ناقہ کے ذریعے یہاں پہنچکر دیوی کے عشق میں گرفتار ہو جاتا۔ حتیٰ کہ سال کے اختتام پر اُسکی قربانی کر دی جاتی ...."

اس طریقے سے کئی سال تک قربانی کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن آج سے دو سال پیشتر ایک ہندی سیاح نے جس کا نام خلیل تھا نہ جانے کس طرح اس معبد کا سراغ لگا لیا۔ اُس نے حکومت کو مطلع کرنے کی دھمکی دے کر میرے باپ سے دیوی کی لاش خریدنا چاہی۔ میرا باپ شش وپنج میں پڑ گیا۔ نہ تو وہ دیوی کی لاش کو فروخت کر سکتا تھا۔ اور نہ اس سے پیچھا چھڑا سکتا تھا۔ کیونکہ اُسکے آنے سے چند دن پیشتر سفید قوم کے ایک نوجوان کا خون پیا جا چکا تھا۔ اور سال ختم ہونے سے پیشتر اسکی قربانی جائز نہ تھی۔ میرا باپ تفکرات میں گھر گیا۔ اُسکی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ یہ گتھی کیونکر سلجھائی جائے۔ اُسی حالت میں اُسے دیوی نے حکم دیا کہ اسکی لاش خلیل کو دے دی جائے اور آئندہ سال قربانی بھی غیر ملک میں ہی عمل پذیر ہو۔ چنانچہ دیوی کی لاش کے علاوہ اسکے عشاق میں سے تاتار اور ایک شہزادے کی لاش بھی مع چند نادر اشیاء کے اس کے حوالے کرنا پڑیں۔ ان لاشوں کی قیمت میں اُس نے ہمیں اتنا زر نقد دیا کہ ہمارا کنبہ خوش حال ہو گیا۔"

خلیل دیوی کو لیکنے لے گیا۔ اور میرے باپ کو قربانی کی رسومات ادا کرنے کے لئے اسکے ساتھ جانا پڑا۔ خلیل پر دیوی کے عشق کا بہت بڑا اثر ہوا۔ اور ایام قربانی کے قریب وہ سخت بیمار ہو گیا۔ آخر کار وہ ایک ڈاکٹر کے کہنے پر دیوی کی لاش کو مصر کے عجائب خانہ میں بھجوا دینے پر آمادہ ہو گیا۔ نوتت کے پاسپورٹ وغیرہ کا انتظام کر کے اس کو برطرف کر دیا گیا۔ اور لاشوں کو بھی بذریعہ جہاز مصر روانہ کر دیا گیا۔ مگر دیوی کی روحانی طاقت کامیاب رہی یعنی لاش غلطی سے مال گودام میں پڑی رہی۔ اس عرصہ میں میرا باپ لاش کی خفیہ طور پر نگرانی کرتا رہا حتیٰ کہ قربانی کی مقدس رات آ پہنچی۔ نوتت نے اپنے منتروں سے دیوی کو مال گودام میں ہی جگا دیا۔ جو نوتت کے ہمراہ خلیل کے گھر گئی اور قربانی کی رسم ادا کر کے اپنے تابوت میں واپس آ گئی............ اسی صبح کو دوسرا جہاز روانہ ہونے والا تھا۔ جس کے ذریعے یہ دوبارہ مصر میں آ گئی اور ہم لوگ عجائب خانہ میں اس لاش کے بدلے ایک اور لاش رکھکر اسے چرا لائے اب میرے باپ کو آئندہ سال کی قربانی کے واسطے پھر فکر لاحق ہوئی تو دیوی نے اسے بتایا کہ آئندہ سال کے لئے وہ نوجوان منتخب ہو چکا ہے۔ جو اسے خلیل کے گھر دیکھنے آیا تھا............ مگر تم دور تھے اس لئے تمہارے یہاں لانے کے لئے میرے باپ کو سخت محنت کرنا پڑی۔ وہ پورے دس ماہ منتر جپتا رہا تاکہ تم نیند کی حالت میں روزانہ اپنی بیوی کو چھپکلی کے پیٹنے کا نہر

دے کر ہلاک کر دو چونکہ خلیل کے گھر تم نے باوجود دیوی کی محبت کا اقرار کرنے کے بیوی کی خوشنودی کے لئے اُسے دیوی سے بہتر قرار دے کر دیوی کی توہین کی تھی اس لئے وہ تمہاری بیوی کو ہلاک کر کے اپنے انتقام کی آگ بجھانا چاہتی تھی -

.... وہ زہر جو تم اپنی بیوی کو حالتِ خواب میں دیا کرتے تھے - وہ ان چند مصری نادر اشیا میں موجود تھا - جو تمہیں خلیل کے ورثہ میں ملی تھیں - لیکن تمہاری بیوی کی زندگی باقی تھی - تم اُسے اپنے ساتھ مصر لے آئے - وہ اس زہر کا تریاق استعمال کرتے سے بچ گئی - اسی تنگ و دو میں سال ختم ہو گیا - آج قربانی کی مقدس رات ہے لہٰذا اب تم جوانمردی سے قربانی کے واسطے تیار ہو جاؤ "

عالم یاس میں میں نے سب باتیں سنیں کبھی کبھی مجھے خیال آتا کہ میں کوئی خوفناک خواب دیکھ رہا ہوں میری حالت سخت خراب ہو رہی تھی - گو میں زندہ تھا مگر مردوں سے بدتر لوٹ نہایت خلوص و عقیدت سے اپنے کام میں مصروف تھا صحرائی جھٹ ایک سنگِ جراحت کا پیالہ اور ایک پتھر کی چھری اٹھا لایا - آہ یہ ویسا ہی پیالہ اور ویسی ہی چھری تھی - جیسا کہ میں خلیل کے گھر دیکھ چکا تھا - شدت خوف سے میں تشنج کے مریض کی طرح اکڑ کر رہ گیا -

صحرائی نے چھری اُس لاش کے ہاتھ میں دے دی اور پیالے کو میری گردن کے قریب لگا دیا - لاش میرے قریب آ گئی - حتیٰ کہ اُسکے کپڑے میرے ہاتھوں کو چھونے لگے - اسکا چھری والا ہاتھ آہستہ آہستہ میری گردن کی سیدھ

پر اٹھا۔ میرے حواس جواب دینے لگے۔ کمرہ گھومتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ میں نے مایوسی سے آنکھیں بند کر لیں۔

قریب تھا کہ میرے قلب کی حرکت بند ہو جائے۔ یکایک ایک زبردست دھماکا ہوا "نادن! نادن!" کی آواز سے کمرے میں ایک خوفناک گونج پیدا ہوئی اور مجھ پر ایک پُرسکون غنودگی طاری ہو گئی۔

(۵)

کچھ دیر بعد جب میں اس مرگ نما غنودگی سے ہوشیار ہوا۔ تو عمر آفندی اپنے رومال سے مجھے ہوا دیتا ہوا دکھائی دیا۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

کمرے میں بدستور شمعیں روشن تھیں۔ آگ کا الاؤ جل رہا تھا۔ مگر آدمی سب غائب تھے۔ قریب ہی صحرائی کی نعش پڑی تھی اور سنگِ جراحت کا پیالہ گر کر چور ہو چکا تھا۔ میں بے تحاشا چیخیں مارتا ہوا عمر آفندی سے چمٹ گیا۔ اُس کی تسلی آمیز باتوں سے مجھے بہت کچھ ڈھارس ہوئی۔ میں نے اپنے حواس درست کر کے اطمینان سے اپنے گردوپیش دیکھا۔ آہ! شہ نشین کے قریب ایک ایسا نظارہ میری نظر سے گزرا کہ ایک دفعہ پھر اضطرابی کیفیت سے میری حالت غیر ہونے لگی لیکن عمر آفندی نے مجھے سنبھال لیا۔

نوت اُسی طرح شہ نشین کے سہارے بیٹھا تھا۔ اور مرتشیار کی لاش اپنی باہیں اسکے گلے میں حمائل کئے اُسکی آغوش میں پڑی تھی۔ پتھر کی چھری نوت کی شہ

رگ میں پیوست تھی۔ اور خون کے بہتے ہوئے شراٹے لاش کے نیم وا دھن میں گر رہے تھے۔ وہ دم توڑ رہا تھا۔

عمر آفندی کے آدمیوں نے اس لاش کو نوت کی آغوش سے علیحدہ کرنا چاہا مگر اس نے اشارے سے روک دیا اور سسکتی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ "مجھے اس سے جدا نہ کرنا۔ میں اس معبودہ کی آخری قربانی ہوں۔ آہ میں پہلے دن سے ہی اسکی محبت میں اسیر ہو گیا تھا۔ لیکن جان کے خوف سے آج تک اپنے عشق کا اظہار نہ کر سکا۔ میرا خیال تھا کہ یہ راز اس پر کبھی ظاہر نہ ہو گا۔ مگر وہ عالم الغیب تھی اس سے پردہ داری فضول تھی۔ آج میں اسکی عظمت و جبروت کی گواہی دیتا ہوں۔ وہ بلاشبہ دیوی تھی جس نے اپنے سچے عاشق کے دل کی ترجمانی کر کے اسکی قربانی قبول کی۔ اب میں خوشی کی موت مر رہا ہوں" یہ کہتے ہوئے اسکی آواز بند ہو گئی وہ ختم ہو چکا تھا۔

عمر آفندی کے ایما پر اسکے آدمیوں نے شکستہ تابوتوں کی روغنی تختیوں کو جمع کر کے نوت اور مرینار کی لاشوں کو جلا دیا۔ اور راکھ بھسم ہو جانے پر جب ہم اس منحوس تہ خانے سے باہر نکلے تو صبح صادق کے نورانی پرتو سے شب کی سیاہی ڈھل چکی تھی۔

کئی دن تک اس خوفناک واقعہ کا اثر میرے دل پر قائم رہا۔ رفتہ رفتہ جب میرے دل کو قرار ہوا تو میں نے عمر آفندی سے بروفتامداد کے متعلق دریافت

کیا اُس نے کہا جب تم مصر میں آئے تھے تو سعید نے مجھے ایک چٹھی لکھی جس میں اُس نے مصری لاش کا ذکر کر کے لکھا کہ کہیں تم خود نسیمہ کو زہر نہ دے رہے ہو۔ سو اس کے علاج کے علاوہ اُسے تم سے بچانے کی بہت کوشش کی گئی چنانچہ اس طریق عمل سے وہ موت کے مُنہ سے بچ گئی .... مجھے سخت حیرت تھی کہ باوجود اتنی محبت کے تم یہ فعل کیوں کر رہے تھے اور مجھے یہ راز معلوم کرنیکی خواہش تھی کچھ دن بعد نسیمہ نے مجھے بتایا۔ کہ تم اکثر راتوں کو اپنی خواب گاہ سے غائب ہو جاتے ہو۔ میں تمہاری نگرانی کرنے لگا جس سے بہت جلد میں نے معلوم کر لیا کہ تمہیں نیند کی حالت میں چلنے پھرنے کا عارضہ لاحق ہے۔........ اب یہ راز تو حل ہو چکا تھا۔ مگر تمہاری یہ حالت دیکھکر مجھے بہت تشویش ہوئی۔ اور تمہاری لاعلمی میں تمہارا علاج کرتا رہا۔ رفتہ رفتہ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ تم ایک باد رفتار ناقہ کے انتظار میں سڑک پر کھڑے رہتے ہو اور اکثر اوقات اسکے پیچھے اس قدر تیزی سے دوڑتے ہو کہ تمہارا تعاقب محال ہو جاتا ہے.......... چنانچہ قربانی کی رات جب تم ناقہ پر سوار ہو کر کہیں جا رہے تھے۔ تو میں نے اپنے دونوں سائیسوں کو پیچھے آنے کا حکم دے کر اپنے گھوڑے عُوف پر تمہارا تعاقب کیا۔ ناقہ جادو کے اثر سے اس قدر تیز چل رہی تھی۔ کہ تعاقب کرنا مشکل ہو گیا۔ تاہم میں گھنٹی کی آواز پر گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا وہاں تک پہنچ گیا۔

"اتنے میں میرے سائیس بھی مجھے آملے اور کافی دیر تک ہم لوگ دروازے

کی تلاش میں اس غار کے اندر سرگرداں رہے آخر کار بڑی مشکلوں سے ہمیں ایک چور دروازے کا سراغ ملا اور جب ہم لوگ اندر داخل ہوئے تو معاملہ ایک خطرناک حد تک پہنچ چکا تھا۔ میں نے وقت کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے گولی چلا دی جس سے صحرائی تو اسی دم مرگیا اور منتر پڑھنے والے بھاگ کھڑے ہوئے اسی بدحواسی میں نونت کے ہاتھ سے بھی ساز گر پڑا۔

" ساز اور منتر بند ہوتے ہی اس لاش کی شیطانی قوت بھی زائل ہوگئی۔ وہ تیورا کر نونت پر گر گئی اور اتفاق سمجھو یا حقیقت لاش کا سر اسکی چھاتی کے قریب جا لگا اور اس طرح وہ نونت کا خون پینے میں کامیاب ہوگئی۔"

اس واقعہ سے تقریباً ایک ماہ بعد ہم لوگ اپنے وطن کو واپس چلے آئے اب زمانہ قدیم کی معلومات کا خبط میرے دماغ سے نکل چکا تھا چنانچہ گھر پہنچتے ہی میں نے پرانی معلومات کا وہ ذخیرہ جو کاغذات کی صورت میں جمع تھا۔ اور وہ نادر اشیا جو خلیل کی وراثت میں مجھے ملی تھیں۔ نذر آتش کر دیں۔

منوہر

شملہ

۳۰ر اکتوبر ۱۹۳۷ء

میں متمول باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ میرے والد احمد آباد کے مشہور تاجر تھے۔ میری نانی اماں اور ماموں جان مجھے بہت چاہتے تھے۔ اس لئے میری والدہ ہر روز سہ پہر کو مجھے ملازم کے ہمراہ ماموں جان کے گھر بھیج دیا کرتیں۔ میرے ننھیال کے محلّے میں ایک بوسیدہ مکان تھا جس کی مالکہ ایک اُدھیڑ عمر کی زرد رو مگر حسین عورت تھی۔ محلّے کے چھوٹے بڑے سب اُسے بہن رکمنی کہتے تھے۔

یہ عورت بہت غریب اور دھرماتما تھی۔ اُسکے بوسیدہ مکان میں نادار

اور ایا پاپیچ لوگوں کا ڈیرا لگا رہتا۔ وہ دن بھر سوت کا تا کرتی۔ اور رات کو جو کچھ آسے میسر آتا وہ غریب لوگوں کی مدد میں صرف اکر دیتی۔ میں نے نانی اماں کی زبانی سن رکھا تھا۔ کہ بہن رکمنی کا شوہر اپنی شادی کے تھوڑے ہی دنوں بعد کہیں روزگار کی تلاش میں نکل گیا۔ اور پھر واپس نہیں آیا۔ انہی دِنوں سے بہن رکمنی اپنے خاوند کے گھر بیٹھی زندگی کے دِن کاٹ رہی تھی۔

بہن رکمنی نہایت خوش خلق اور ملنسار تھی۔ نانی اماں کے گھر جاتے ہوئے کبھی میرا اس کا سامنا ہوتا تو وہ نہایت محبت سے میری والدہ وغیرہ کی خیرو عافیت پوچھا کرتی۔ ایک دفعہ جب گرمیوں کے موسم میں نانی اماں کے گھر گئی تو اس کا دروانہ بند تھا اس کے بعد ہر روز اس کا دروازہ بند پاکر میں نے نانی اماں سے دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ تیرتھ یاترا کرنے گئی ہے۔

مدت دراز تک اُس کا دروازہ بند رہا۔ اب میں عمر کی سولہ بہاریں دیکھ چکی تھی۔ ایک دن نانی اماں کے گھر گئی تو گلی میں آدمیوں کا ہجوم تھا۔ آگے بڑھی تو معلوم ہوا بہن رکمنی کا دروانہ کھلا ہے اس کے گھر ڈھولک بج رہا ہے اور بہت سے برہمن اکٹھے ہو کر مذہبی رسومات ادا کر رہے ہیں۔

میں نے نانی اماں سے جا کر اس بھیڑ بھاڑ کے متعلق دریافت کیا انہوں نے بتایا کہ رکمنی بیچاری باوجود مفلسی کے تمام دُنیا کے تیرتھ یاترا کر کے واپس آئی ہے۔ اب اُس نے تلسی کا بیاہ رچایا ہے۔ میں نے تعجب سے کہا۔ نانی اماں تلسی کون

ہے۔ وہ بولیں تلسی ایک پودا ہوتا ہے جسے ہندو لوگ مقدس سمجھتے ہیں اور اکثر مذہب کے پابند کارِ ثواب سمجھ کر اسکی شادی رچاتے ہیں۔

دوسرے دن شام کے قریب جب میں نانی اماں سے رخصت ہو کر بہن رکمنی کے دروازے سے گزرنے لگی تو میں نے دیکھا کہ اس کے وسیع صحن کے ایک کونے میں پیپل کے پیڑ کے نیچے ایک چبوترا بنا ہوا ہے۔ اس پر بہن رکمنی پالتی مارے بیٹھی ہے۔ اس کے سامنے ایک پیتل کی تھالی میں آٹے کے بنے ہوئے چند دیئے جل رہے تھے۔ شاید وہ کچھ عبادت کر رہی تھی۔

میں دروازے پر کھڑی ہو کر نہایت دلچسپی سے اسکی حرکات و سکنات دیکھنے لگی۔ جب وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر اٹھی تو مجھے دروازے پر کھڑا پا کر بہت خوش ہوئی۔ اور بڑے خلوص سے مجھے اندر بلایا۔ میں اسی بات کی منتظر تھی فوراً اندر چلی گئی۔ اس نے مجھے لکڑی کی چوکی پر بٹھایا اور گھر والوں کے حالات دریافت کرنے لگی۔

میں نے اِدھر اُدھر کی باتیں جلدی ختم کرتے ہوئے کہا۔ "بہن رکمنی کل تمہارے گھر میں کیا تقریب تھی؟"

وہ بولی "بیٹی تلسی کا بیاہ تھا۔" میں نے کہا "تلسی کون ہے؟" وہ کہنے لگی بیٹی تلسی ایک دیوی تھی۔ جو کرشن بھگوان کی پٹ رانی تھی۔ ہم لوگ کرشن بھگوان کی مورتی سے اسکی شادی کرتے ہیں اور برہمنوں کو دان دیتے ہیں۔ ایسا کرنے

سے انسان کی مصیبتیں دور ہو جاتی ہیں

میں نے اُسکی خوش اعتقادی پر مسکراتے ہوئے کہا۔ کسی برہمن نے تمہیں یہ طریقہ بتایا ہوگا۔ وہ بولی "نہیں بیٹی برہمنوں کے کہنے سے تو یہ کام میں نے نہیں کیا۔ میں نے تو ایک یوگی کا فرمان پورا کیا ہے۔" پھر مجھے اُس کی تفصیل کی مشتاق پاکر بولی " بیٹی میں بہت غریب ہوں اور باوجود اس مفلسی کے تیرتھ یاترا کرنے کا مجھے بہت شوق تھا۔ مگر مجبور تھی۔ مگر روپیہ کے بغیر یہ کام محال تھا۔ ایک دفعہ میرے گھر میں ایک بھگت مہاراج آئے جو تمام دُنیا کے تیرتھ یاترا کر چکے تھے۔ میں نے اُن سے اپنے شوق کا اظہار کیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ کئی آدمی بغیر روپیہ کے تیرتھ یاترا کرتے ہیں............ کیونکہ یاتریوں کی بہت عزّت کی جاتی ہے۔ جس منزل پر وہ قیام کرتے ہیں لوگ اُنکی سیوا کرتے ہیں۔ اُنکی زبانی یہ حالات سنکر مجھے بھی شوق چرایا۔ میں گھر سے نکل کھڑی ہوئی اور راستے میں ایک مفلس ٹولی سے متعارف ہوگئی۔ جو تیرتھ یاترا کرنے جارہی تھی۔ چنانچہ میں بھی اُن یاتریوں کے ساتھ ہو لی۔ جوں جوں ہم لوگ آگے بڑھتے گئے۔ ہماری ٹولی میں اضافہ ہوتا گیا۔ امرناتھ جاتے ہوئے ہماری ٹولی میں ایک نوعمر اندھا یوگی بھی شامل ہوا۔ گو یہ لڑکا اندھا تھا مگر بہت ہی شوخ اور لاپرواہ تھا۔ باوجودیکہ اسکی شوخیوں اور شرارتوں کے میں نے اسکی چند ایک کرامات ایسی دیکھیں جس کی وجہ سے میرے دل میں اس کا احترام ہوگیا میں خلوص و عقیدت

سے اسکی خدمت کیا کرتی۔

وہ میری اس بے لوث خدمت گذاری پر بہت خوش ہوتا۔ ایک دن اُسے مہربان پاکر میں نے کہا" یوگی میرے لئے دعا کر کہ پرماتما میرے دکھ دور کرے"

میری اس التجا پر وہ خاموش ہو کر سوچنے لگا۔ پھر کچھ دفعہ کے بعد بولا "تم گھر جاکر تلسی کا بیاہ کرو اور برہمنوں کو دان دو۔ تمہاری سختی دور ہو جائیگی" میں پہلے ہی اسکی کرامات کی قائل تھی۔ لیکن اس وقت میں نے اس کے معصوم چہرے پر ایسا جلال دیکھا جیسا کسی مہاتما یا رشی کے سوا ممکن نہیں مجھے یقین ہو گیا۔ کہ یوگی کا کہنا کبھی خطا نہیں ہوگا۔ اسی دن وہ اندھا یوگی غائب ہو گیا سو اسی لئے میں نے گھر آتے ہی سب سے پہلے یہ کام ضروری سمجھا۔"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا" اچھا بہن رکمنی خدا کرے تمہارا شوہر جلدی واپس آئے اور تم سکھی ہو جاؤ"

وہ آہ سرد بھر کر بولی" بیٹی ان باتوں سے مرے ہوئے تو کبھی بھی واپس نہیں آسکتے۔ اگر پرماتما میری بیماری دور کر دے تو بے شک سکھی ہو جاؤں" میں نے پوچھا" تمہیں کیا بیماری ہے" سو بولی" بیٹی مجھے بچپن سے کلیجہ پر پھوڑا ہے جو اب خطرناک صورت اختیار کر گیا ہے"۔ یہ کہتے ہوئے اُس نے پیٹ پر سے کپڑا اٹھا کر کلیجہ سے پٹی ہٹائی۔ اُف! اسکے کلیجہ پر اتنا بڑا ناسور تھا کہ میں کانپ

اُٹھی، نہ چلنے وہ کیونکہ زندہ تھی۔"

میں نے کہا "بہن رکمنی کبھی ڈاکٹر کو بھی تم نے یہ پھوڑا دکھایا ہے"۔ وہ بولی "نہیں بیٹی۔ میں ڈاکٹروں کو دکھانا پسند نہیں کرتی کیا خبر اُن کی دوائیاں کیسی بھلی بُری چیزوں کی آمیزش سے تیار ہوتی ہیں۔ میں دُنیا کے پیچھے اپنا جنم بھرشٹ کیوں کروں؟"

ایسی نیک عورت کو دکھ درد میں مبتلا دیکھ کر میرا دل بہت آزردہ ہوا میں دل برداشتہ اپنے گھر چلی آئی۔ گھر آکر میں نے ابا جان سے اُسکا ذکر کیا۔ وہ کہنے لگے "میرے پاس ناسور کی ایک مرہم ہے جو ایک بزرگ کا عطیہ ہے۔ اگر رکمنی مسلمان ہوتی تو میں اُسے ضرور مرہم دیتا۔ کیونکہ اُس بزرگ نے مرہم کے ساتھ قرآن کریم کی ایک آیت کا ورد لازمی قرار دیا ہے میں نے کہا یہ تو معمولی بات ہے جب میں نانی اماں کے گھر جایا کروں گی تو آیت پڑھ کر اسکے پھوڑے پر مرہم لگا دیا کروں گی۔

دوسرے دن میں وہ مرہم لے کر اُسکے گھر گئی اور اُس کو سب معاملہ سمجھایا۔ اُس نے میری ہمدردی سے متاثر ہو کر اس مرہم کا استعمال شروع کر دیا۔ خدا کے فضل سے چند ہی دنوں میں اُسے افاقہ معلوم ہونے لگا۔ وہ میری بہت شکر گزار تھی۔ رفتہ رفتہ اس کا ناسور بھرنے لگا اور ڈیڑھ دو مہینے کے اندر اس کا وہ خوفناک پھوڑا بالکل اچھا ہو گیا۔ غسل صحت کے بعد وہ ہمارے گھر آئی۔

وہ مجھے دیوی کا اوتار کہتی اور بار بار میرے پاؤں کی دُھول اپنے ماتھے پر لگاتی۔ اُس کو ہمارے خاندان بھر سے عقیدت ہو گئی۔

(۲)

اس کے صحت یاب ہونے کے چند دن بعد ابا جان یکایک قلب کی حرکت بند ہو جانے سے فوت ہو گئے۔ ہم لوگوں پر کوہ الم ٹوٹ پڑا۔ بہن رکمنی بھی دوسرے عزیزوں کی طرح ہماری شریکِ غم تھی۔ ابا جان کی وفات کے تھوڑے عرصہ بعد ہمیں معلوم ہوا کہ ہماری تجارت بگڑ گئی ہے اور لوگوں کا بہت سا روپیہ ہمارے ذمہ ہے۔ یہ وقت ہم لوگوں پر بہت نازک تھا۔ ماموں جان نے بہت کوشش کی کہ ہماری عزت بنی رہے۔ مگر اُن کے بنائے کچھ بن نہ پڑا اور چند دنوں میں ہماری تمام جائداد قرضخواہوں نے قرق کرالی۔ میں اور میری والدہ کے دل پر والد کی وفات اور گھر کی بربادی کا ایسا صدمہ ہوا کہ چھ مہینے کے اندر اندر والدہ بھی داغِ مفارقت دے گئیں۔

میری منگنی ابا جان کی زندگی میں ہی نیاز کے ساتھ ہو چکی تھی۔ نیاز کے والدین میرے ابا کے عزیزوں میں سے تھے۔ وہ اپنے لڑکے کو ولایت بھیجنا چاہتے تھے۔ اور اُن کا خیال تھا۔ کہ ولایت جانے سے پہلے اُس کی شادی کر دی جائے چنانچہ والدہ کی وفات کے چند ماہ بعد ہی وہ شادی کا اصرار کرنے لگے اور مجبوراً ماموں جان کو میری شادی کر دینی پڑی۔

نیازؔ شادی سے ایک مہینہ بعد ولایت چلا گیا۔ اور میں اپنی ساس کے پاس رہنے لگی میری ساس کے دو ہی بچے تھے۔ ایک نیازؔ اور دوسری رابعہ جو نیازؔ سے چار سال چھوٹی اور بے حد لاڈلی تھی وہ شادی شدہ تھی اُس کا خاوند پونا میں انجینئر تھا۔ میری شادی کے چند ماہ بعد اس کے خاوند اختر کا تبادلہ احمد آباد میں ہو گیا۔ وہ بمعہ اپنے خاوند کے میکے میں ہی رہنے لگی۔

رابعہ تند خو اور آتش مزاج لڑکی تھی۔ وہ مجھ پر بے جا سختیاں کرنے لگی۔ گو ساس میری حمایت کیا کرتی۔ مگر اُسے کسی کی پرواہ نہ تھی۔ اُس نے میرا ماموں جان کے گھر جانا بند کر دیا۔ اور اسی پر ہی اکتفا نہ کیا۔ بلکہ میری شکائتیں لکھ کر نیازؔ کو بھیجنے لگی۔ جس پر وہ مجھے خطوں میں ڈانٹ ڈپٹ کرتا رہا۔ آخر نہ جانے اُس نے بھائی کو کیا لکھا کہ وہ مجھ سے بالکل متنفر ہو گئے اور خط و کتابت بند کر دی میں ہمیشہ رابعہ کی منت اور خوشامد کیا کرتی۔ مگر وہ سنگدل دن بدن میرے خون کی پیاسی ہوتی گئی۔ اسی ابتر حالی میں میری شادی کو تین سال گذر گئے۔ نیازؔ اب بیرسٹری پاس کر کے آنے والا تھا۔ اس کے والدین بہت مسرور تھے بڑی دھوم دھام سے اسکے استقبال کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مجھے اُمید تھی کہ ساس کہہ سن کر نیازؔ سے میری صلح کرا دے گی۔ لیکن نیازؔ کو دیکھ کر میری سب امیدوں پر پانی پھر گیا۔ کیونکہ اُس کے ساتھ ایک یورپین عورت تھی۔

میم صاحبہ کے لئے گھر کا آدھا حصّہ خالی کر دیا گیا۔ وہ اور بنیا زے علیحدہ رہنے لگے۔ رابعہ مجھ سے بدستور دشمنی رکھتی۔ میم صاحبہ کے آنے سے اتنی سہولت ضرور ہوئی۔ کہ مجھے ماموں جان کے گھر جانے کی اجازت مل گئی سوکن جلاپا بری بلا ہے۔ یہ صدمہ میرے لئے ناقابل برداشت تھا۔ میں اپنے ماموں جان کے کے گھر چلی آئی

ننھیال پہنچکر میں نے دیکھا کہ بہن رکمنی کے بوسیدہ مکان کی جگہ ایک عالی شان حویلی کھڑی ہے میں نے نانی اماں سے اس کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ بہن رکمنی کا خاوند بائیس سال کے بعد بہت سا روپیہ کما کے واپس آیا ہے۔ اور اب وہ بہت سکھی ہے۔ میرے آنے کی خبر سن کر وہ دوڑی آئی اور میری بلائیں لینے لگی۔ وہ سونے میں پیلی ہو رہی تھی اُسے اچھی حالت میں پاکر مجھے بہت خوشی ہوئی۔

ماموں جان کے گھر آکر مجھے سوت کے جلاپے اور رابعہ کی سختیوں سے نجات مل گئی مجھے ایک گونہ سکون محسوس ہوا۔ اور سسرال سے نفرت ہو گئی اُس دن سے پھر میں نے سسرال کا دروازہ نہ دیکھا۔ یہاں میرا بہت سا وقت بہن رکمنی کی صحبت میں گذرتا وہ مجھے اپنی بیٹی کی طرح سمجھتی۔ خدا کی قدرت اسی سال بہن رکمنی بار ور ہوئی اس کے دو توام لڑکے پیدا ہوئے۔ یہ لڑکے نہایت حسین تھے لیکن ان میں سے ایک لڑکا مادر زاد اندھا تھا۔ اس نے اندھے

بچے کا نام منوہر رکھا اور دوسرے کا پرکاش۔ مجھے اندھے بچے سے بہت محبت تھی۔ وہ بچہ بھی بغیر میرے پل بھر چین نہ لیتا۔ بہن رکمنی نے اس بڑھی ہوئی محبت کے احساس سے وہ بچہ مجھے دے دیا۔ اب میں اس اندھے بچے کی محبت کے سہارے اپنی زندگی کے دن گذارنے لگی۔

میں اکثر تنہائی میں نیاز کی سنگدلی اور اپنی بدقسمتی پر آنسو بہایا کرتی جب یہ بچہ کچھ سیانا ہؤا تو میری سسکیوں کی آواز پر وہ بھی رونے لگتا۔ منوہر کی عمر تقریباً پانچ سال کی تھی۔ میں بیٹھی رو رہی تھی۔ یہ کھیلتا ہؤا آیا۔ اور میرے گلے میں باہیں ڈال کر پیار سے میرے منہ پر ہاتھ پھیرا۔ میرے رخسارے آنسوؤں سے تر پا کر اداسی سے کہنے لگا۔ ماں تم کیوں رویا کرتی ہو۔ تمہیں کون مارتا ہے؟

میں نے اُسے بہلانے کے لئے کہا۔ "تم اُسے نہیں جانتے"۔ وہ بولا "نہیں ضرور بتاؤ وہ کون آدمی ہے" میں نے کہا "وہ ظالم آدمی ہے" اس نے کہا "وہ کہاں رہتا ہے"۔ میں نے جواب دیا "بہت دور" وہ نہایت بھولے پن سے کہنے لگا۔ "اب کبھی مارنے آئے تو مجھے بتانا میں اُسے ٹھیک کر لوں گا"۔ مجھے اسکی باتوں پر ہنسی آگئی۔ میں نے کہا بڑھ بڑھ کے باتیں بناتے ہو۔ اگر وہ تمہیں دیکھ پائے تو اتنا پیٹے کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے"۔ وہ شوخی سے کہنے لگا۔ "اونہہ! وہ کون آیا بڑا پیٹنے والا میں اُسے تگنی کا ناچ نچا دوں"۔

اس دن سے منوہر کے دل میں کچھ ایسا خیال سمایا کہ وہ اکثر رات کو

سونے وقت ظالم آدمی کا ذکر چھیڑتا۔ اس کی شکل و صورت اور نام وغیرہ دریافت کرتا اسی طرح زمانہ گزرتا گیا حتےٰ کہ منوہر دس سال کا ہو گیا۔ وہ بہت ہی شوخ لڑکا تھا۔ سوائے پرکاش کے جو کبھی کبھی اس سے ملنے آیا کرتا اور کسی بچے کو پاس پھٹکنے بھی نہ دیتا۔ وہ پھولوں کا بہت شائق تھا۔ اس لئے میں ہمیشہ شام کے قریب اس کو کسی باغ میں لے جایا کرتی۔

(۳)

گلابی جاڑے کی بانکی شام تھی۔ چاند کی ٹھنڈی میٹھی روشنی دل کو لبھا رہی تھی۔ شفق کی سُرخی نے ابروئے فلک پہ گلال چھڑک رکھا تھا۔ رنگ و بو میں سرشار ہوا کے ننھے ننھے جھونکے طفلانہ شوخی سے چل رہے تھے۔ میں اور منوہر ایک باغ میں بیٹھے تھے۔ منوہر ظالم آدمی کا اس طرح ذکر کر رہا تھا۔ جیسے وہ عنقریب اس سے بدلہ لے گا۔

ہم کافی دیر تک وہاں بیٹھے رہے۔ منوہر میٹھی میٹھی باتوں میں اپنی شیخیاں بگھارتا ہوا پھولوں سے کھیلتا رہا۔ آخر کار میں نے کہا "منوہر وقت بہت ہو گیا ہے۔ ہمیں واپس چلنا چاہیئے"۔ وہ بولا "میں ابھی نہیں جا سکتا" میں نے کہا "کیوں" وہ کہنے لگا۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا"۔ میں نے کہا "کون سا وقت" اُس نے کہا "ظالم آدمی سے ملنے کا"۔ یہ کہکر وہ قلانچیں بھرتا ہوا گھاس کے تختوں پر دوڑنے لگا۔ اُسکے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اندھا نہیں ہے۔

میں نے اسکی حالت پر تعجب کرتے ہوئے کہا "منوہر اس طرح بے تحاشا نہ دوڑو کہیں گر کر تمہیں چوٹ نہ آجائے۔ وہ بولا "چوٹ کیوں آئیگی ماں" پرکاش ہر روز اسی طرح دوڑتا ہے اُسکے کبھی چوٹ نہیں آئی"۔ میں نے کہا وہ تو آنکھوں والا ہے" وہ کہنے لگا "تو کیا میں آنکھوں والا نہیں"۔ میں اس کا جواب سنکر خاموش ہوگئی مجھے گوارا نہ تھا کہ اندھا کہکر اس کا دل دکھاؤں"۔ اس لئے میں نے اُسے ٹالتے ہوئے کہا "وہ سکول میں پڑھتا ہے تم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے"۔ وہ بے پرواہی سے کہنے لگا "سکول پڑھنا کونسی بڑی بات ہے اگر میں پڑھنے لگوں تو کبھی وہ میرا مقابلہ نہ کر سکے مگر پڑھنے میں میرا دل نہیں لگیگا"۔ وہ پھر کھیل کود میں مصروف ہو گیا۔ اور میں چپ چاپ اُسکی دلچسپ حرکتوں کو دیکھتی رہی آج سے پہلے میں نے کبھی اُسے اتنا خوش نہ دیکھا تھا۔ اُسکی معصومانہ شوخیوں سے میرا دل باغ باغ ہو رہا تھا۔

بہت دیر تک اسی طرح کھیل کود میں مصروف رہنے کے بعد خود بخود کہنے لگا "چلو ماں گھر چلیں"۔ میں نے طنزاً کہا۔ ابھی کاہے کو جاتے ہو"۔ کیا کھیل سے اتنی جلدی اکتا گئے۔ وہ منہ بنا کر کہنے لگا "اکتایا تو نہیں لیکن اب جانا ہی بہتر ہے"۔

ہم دونوں باغ سے باہر نکلے میرا ارادہ سواری پر جانے کا تھا۔ مگر منوہر مچل گیا کہ میں پیدل ہی چلوں گا۔ میں نے اُسے پیار سے سمجھایا۔ پھر سختی سے

کہا تاہم اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ بلکہ وہ بسورنے لگا۔ میں مجبور ہو گئی۔ رات کا وقت ویران راستہ اندھے بچے کا ساتھ عجب مصیبت کا سامنا تھا۔ میں آگے منوہر مجھ سے دو قدم پیچھے تھا۔ میں اس کا ہاتھ پکڑے اس کو لے جا ضد پر ملامت کرتے ہوئے آہستہ جا رہی تھی۔

ایک جگہ یکایک منوہر ٹھہر گیا۔ میں نے کہا "اب ٹھہرنے کا وقت نہیں جلدی چلو اور اُسکا ہاتھ کھینچنے لگی۔ وہ متانت سے بولا "یہاں ٹھہرنا ضروری ہے" میں نے خفگی سے پوچھا "کیوں"۔ اس نے جواب دیا "وہ آرہا ہے"۔ میں نے جھنجھلا کر کہا "کون آرہا ہے؟" وہ بولا ظالم آدمی"۔ میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا تو دور سڑک پر ایک شخص سر جھکائے اندھا دھند آرہا تھا۔ گو دور ہونے کی وجہ سے اسکی شکل وصورت تو نہ دکھائی دیتی تھی۔ مگر اسکی لڑکھڑاتی ہوئی چال سے ظاہر تھا کہ کوئی شرابی ہے۔ میں نے کہا "منوہر خاموش ہو جاؤ کوئی شرابی آرہا ہے" یہ کہتے ہوئے میں سڑک کے ایک طرف سرکنے لگی۔ منوہر بولا "ماں سیدھا چلو۔ درختوں کی طرف کیوں جا رہی ہو؟" مجھے حیرت تھی کہ میرا سڑک سڑک سے نیچے اترنا اور شرابی کا آنا جو ابھی بہت دور ہے۔ اسے کس طرح معلوم ہوا۔ میں نے اُسے بہلانے کے لئے کہا "میں تو بالکل ٹھیک چل رہی ہوں" وہ ہنس کر کہنے لگا "ماں مجھے چکمے دیتی ہو" میں نے کہا "کہ تم نے کیسے دیکھا کہ یہ غلط راستہ ہے؟" وہ بولا "جیسے تم دیکھ رہی ہو" میں نے جھلاتے

ہوئے کہا۔" میں تمہاری طرح اندھی تو نہیں ہوں"۔ آج یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں نے اُسے اندھا کہا۔ میرا خیال تھا کہ ابھی منوہر مجھ سے پُوچھے گا کہ اندھا کسے کہتے ہیں۔ مگر وہ بولا" اچھا ماں ہم نے بغیر آنکھوں سے ہی ظالم آدمی کو پہچان لیا۔ لیکن تم آنکھوں والی ہو کر بھی نہ پہچان سکی"۔ اس اثنا میں وہ شخص کچھ قریب آگیا۔ منوہر پھر بولا" چلو ماں ظالم آدمی سے ملو"۔ میں نے کانپ کر کہا" منوہر خدا کے لئے چپ رہو۔ نہ جانے وہ کون ہے میں عورت ذات ہوں اگر کوئی کچھ کہہ بیٹھے تو کیا ہو"؟ منوہر کہنے لگا" ماں میرے ساتھ ہونے کے باوجود بھی کیوں اتنا ڈرتی ہو"۔

میں نے اسکی لاف زنی سے تنگ آکر کہا" ہاں تمہارے ساتھ ہوتے مجھے کیا خوف ہو سکتا ہے۔ تم تو بڑے تیس مار خان ہو"۔ وہ بولا" دکھادوں تیس مارخانی" یہ کہتے ہوئے اُس نے زور سے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ مجھ سے چھڑا لیا۔ اور آنے والے آدمی پر جھپٹا۔ اُس نے ہوا میں کوئی لمبی سی چیز اچھالی یہ شاید اسکی چھڑی تھی۔ جو اس نے آنے والے شخص پر پھینکی یہ سب کچھ آن واحد میں ہو گیا۔ میں بوکھلائی ہوئی اس کی طرف دوڑی لیکن وہ جست کر کے آگے بڑھ گیا۔ یکایک کسی زبردست چیز کی ٹکر سے میں بیہوش ہو گئی

(۴)

جب میری آنکھ کھلی تو میں ہسپتال میں پڑی تھی۔ منوہر مغموم صورت

بنائے میرے پلنگ کے قریب ایک اسٹول پر بیٹھا تھا۔ میں نے کراہتے ہوئے پوچھا "منوہر میں کہاں ہوں" میری آواز سنکر اُس کا مرجھایا ہوا چہرہ روشن ہو گیا۔ مگر قبل اس کے وہ کچھ جواب دے ایک نرس میرے قریب آکر کہنے لگی "بی بی! تم ہسپتال میں ہو۔ رات کو ایک رحم دل آدمی تمہیں یہاں لایا تھا موٹر کی ٹکر سے تمہاری ٹانگوں میں چوٹ آئی ہے لیکن کچھ فکر کی بات نہیں۔ آپ جلدی اچھی ہو جائیں گی"!

جب نرس چلی گئی تو منوہر میرے گلے میں باہیں ڈال کر پیار کرنے لگا۔ میں نے اُسے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔ "دیکھو منوہر تمہاری شرارتوں کی بدولت میری یہ گت ہوئی" وہ محجوب ہو کر کہنے لگا "ماں معاف کر دو۔ آئندہ کبھی شرارت نہ کروں گا۔ انسان پر جو بھی تکلیف آتی ہے اُس میں ضرور کوئی مصلحت ہوتی ہے" اُسکی مدبرانہ گفتگو پر میں نے اُسے چوم کر کہا "باتونی لڑکے تجھے یہ مکارانہ باتیں کیسے آگئیں"۔

وہ بہت دیر تک مجھ سے باتیں کرتا رہا اور اس دوران میں اکثر کئی دفعہ دروازے پر جا کر کھڑا ہوتا۔ جیسے کسی کا انتظار ہو۔ دس بجے کے قریب دروازے سے ہٹ کر پھر میرے پاس آیا اور مجھ پہ جھک کر سرگوشی سے کہنے لگا۔ "لو ماں وہ آگیا ہے"! میں نے کہا۔ "کون"؟ وہ بولا "ظالم آدمی" میں نے اکتا کر کہا "پھر بیہودہ بکنے لگے ہو" اسی وقت دروازہ کھُلا۔ اور نرس کے ہمراہ ایک شخص داخل

ہوا۔ منوہر بولا"۔ لو میں جھوٹ کہتا تھا؟"

میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ سچ مچ نرس کے ہمراہ نیاز آ رہا تھا منوہر کی پیشین گوئی پوری ہوتی دیکھ کر ایک دبی چیخ میرے منہ سے نکل پڑی نیاز نے پہلے نرس سے میرا حال دریافت کیا۔ پھر میرے قریب چپ چاپ کرسی پر بیٹھ گیا۔ ادھر میں بھی اس غیر متوقع ملاقات سے سہم کر دم بخود ہو رہی تھی۔ لیکن منوہر نے مہر خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا"ماں اِس نیک آدمی نے تمہیں سڑک سے اٹھا کر ہسپتال پہنچایا تھا" نیاز تعجب سے کہنے لگا"تم نے مجھے کس طرح پہچانا کیا تمہیں کچھ دکھائی دیتا ہے"۔

نیاز پھر خاموش ہو گیا۔ اُسکی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ منوہر اُسے خاموش پا کر دوبارہ کہنے لگا"ماں اس آدمی کا شکریہ ادا کرو" اور اور نہایت چلبلے پن سے میرا ہاتھ پکڑ کر نیاز کے ہاتھ میں دے دیا مجھے منوہر کی اس چاپلوسی پر بے اختیار ہنسی آ گئی۔ نیاز بھی ہنس دیا۔ اُس کے بعد دیر تک گلے شکوے ہوتے رہے۔ نیاز گذشتہ سلوک پر بہت پشیمان تھا۔ وفورِ مسرت سے میرے آنسو رواں تھے۔ نیاز کی بھی ہچکی بندھ رہی تھی۔ نیاز نے پوچھا"یہ بچہ کون ہے؟ میں نے بہن رکمنی کی ساری داستان اُسے سنائی اُس نے خوش ہو کر منوہر کو گود میں اٹھا لیا۔

میرے عزیزوں کو رات والے حادثے کی اطلاع کی گئی۔ ماموں جان

میری گمشدگی سے سخت ہراساں تھے میری خبر پا کر فوراً ہسپتال میں آئے نیاز کے اس اتفاقیہ ملاپ سے سب کو خوشی ہوئی۔ اس اچانک حادثے سے میری قسمت کھل گئی۔ نیاز اکثر دن بھر میرے پاس رہتا۔ وہ میرا ینڈ بے دام ہو چکا تھا اور منوہر سے ایسی محبت کرتا جیسا ایک حقیقی باپ اپنے پیارے بچے سے۔

دس سال کے بعد میں پھر اپنے گھر آباد ہوئی۔ میری ساس اور خسر کا مدت سے انتقال ہو چکا تھا۔ رابعہ گو اب بھی گھر میں موجود تھی۔ مگر وہ پہلے کی طرح بدمزاج رابعہ نہ تھی بلکہ اسکی حالت قابل رحم تھی وہ خود مظلوم تھی۔ نیاز نے مجھے بتایا کہ میم صاحبہ نے جن کو نیاز ولایت سے لائے تھے بے وفائی کی اور طلاق حاصل کر کے اختر سے شادی کر لی۔

ہمارے ملاپ کے ایک ماہ بعد منوہر شام کے قریب نیاز کے ساتھ سیر کو گیا میری طبیعت کچھ ناساز تھی۔ اس لئے میں نہ جا سکی جب وہ واپس آیا۔ تو اُس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ آتے ہی میرے گلے لگ کر روتے ہوئے کہنے لگا۔

"ماں تم نے میری بہت خدمت کی ہے مجھے بخش دو۔ موت میرے قریب نظر آ چکی ہے" نیاز نے بتایا کہ راستے میں منوہر کو قے ہوئی ہے۔

قے ہونا معمولی بات تھی۔ میں نے منوہر کو تسلی دی اور ڈاکٹر کو فون کیا۔ مگر ڈاکٹر کے آنے سے پیشتر اُس کو پھر قے ہوئی اور ڈاکٹر کے آنے تک اُس کی حالت خراب ہو گئی۔ ڈاکٹر نے اُسے بچانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن موت کا خونی پنجہ

اس تک پہنچ چکا تھا۔ وہ سب سے پر محبت اور الوداعی باتیں کرتا ہوا۔ رات کے بارہ بجے کے قریب راہئے عدم ہو گیا۔

(۵)

منوہر کی موت کا مجھے بہت صدمہ ہوا۔ میرا دل دنیا سے اُچاٹ ہو گیا۔ مجھے سودا ہو گیا - کہ اُس کی قبر کھود کر اُسے دیکھوں مگر نیاز میری بڑی نگرانی کرتا۔ اس لئے مجھے اپنی آرزو پورا کرنے کا موقع نہ ملتا۔ ایک روز رات کو نو دس بجے کے قریب جبکہ نیاز کسی دعوت پر تھا۔ میں چپکے سے باہر نکلی اور کرایہ کی گاڑی پر سیدھی قبرستان پہنچی۔

عروج ماہ کی نامکمل چاندنی اس زوال پذیر گشتہء اجل مخلوق کی عبرت آموز آبادی پر ہلکا سا نور برسا رہی تھی۔ قبرستان کے لمبے تڑنگے درختوں کے پتے سہم کر ٹہنیوں سے لپٹ رہے تھے۔ شہر خموشاں کی فضا بھی اپنے مکینوں کی طرح بے جان اور پژمردہ تھی۔ ان خاک آلود نازک تنوں کی بربادی پر واحد نالہ کرنے والا سوسمار کسی شکستہ قبر میں نالہ زن تھا۔ گو میں لرزہ براندام تھی۔ مگر منوہر کی محبت خوف و ہراس پر غالب آ گئی۔ میں نے جان ہتھیلی پر رکھ کر قبر کو کھودنا شروع کر دیا۔ اور اپنی پوری طاقت سے تھوڑے ہی وقت میں تودۂ خاک کو صاف کر دیا۔ چاند نے بھی ہمدردی کے طور پر میرے ساتھ اس قبر میں جھانک کر دیکھا۔ اسکی ٹمٹماتی ہوئی روشنی میں قبر کی تہ صاف دکھائی دی لیکن منوہر کا لاشہ وہاں موجود نہ تھا۔ ناکامی و رکمین گاہ موت کی ٹھنڈی گھری دیواروں کا لمس صندل و کافور

کی افسردہ کرنے والی خوشبو جو گل نہ اور انسانی خون کی گھن سے ملی جلی تھی۔ رونگٹے کھڑے کئے دیتی تھی۔ خوف سے میرے بدن میں رعشہ ہونے لگا۔ ہاتھ پاؤں میں سکت نہ رہی۔ طاقت نے جواب دے دیا۔ اور میں بے ہوش ہو گئی۔

زندگی باقی تھی۔ نیاز مجھے تلاش کرتا ہوا قبرستان میں آیا! اور اٹھا کر گھر لے گیا۔ اس مجنونانہ حرکت سے میں کئی دن بیمار رہی۔ نیاز ڈاکٹروں کے مشورے سے احمد آباد چھوڑ کر مجھے بمبئی لے گیا اور ہم لوگ وہیں رہنے لگے ہمارا خوبصورت بنگلہ ساحل سمندر کے قریب ایسے دلفریب حصے میں واقع تھا۔ جہاں آبنوس کی شاندار سربلندیوں کے نیچے سبز کاہی مائل سمندر کا دلکش نظارہ صاف دکھائی دیتا تھا۔ لب ساحل میلوں تک سرسبز و شاداب سبزہ گاہیں تھیں۔ جن کے مخملی، گھاس کے وسیع تختوں پر نو عروسان چمن رنگین پھولوں کے زیور سے آراستہ و پیراستہ حسن خداداد کی نمائش کر رہی تھیں۔ جا بجا غلط نما کنجوں میں نشستیں بنی ہوئی تھیں جن کی خوشنما سبز ٹٹیوں کی محرابوں پر سدا بہار پھولوں کی بیلیں انوکھی بہار پیدا کر رہی تھیں۔ میں اکثر یہاں آ کر بیٹھتی اور اپنا غم غلط کیا کرتی۔

منوہر کی برسی تھی۔ نیاز کسی کام کے واسطے احمد آباد گیا تھا۔ میں اور رابعہ گھر میں اکیلی تھیں۔ میں نے کھانے پینے کی چیزوں پر اُس کا ختم دلایا اور اس کی تصویر دیکھ کر تمام دن روتی رہی شام کے قریب میرا دل سخت گھبرانے لگا۔ میں چپ چاپ ساحل سمندر کی طرف چل نکلی۔ سورج کی تھکی ماندی کرنیں

کائنات کو بسنتی جامہ پہنا رہی تھیں خوش رنگ سمندر کی آبی لہریں نورانی شان و شوکت سے موجزن تھیں۔ دہر ناپائدار کے ذرّے ذرّے سے حسنِ حقیقی جلوہ نما تھا۔ مجھے منوہر کی یاد بے چین کرنے لگی۔ دل اس کے قرب کا متمنی اور آنکھیں اسکی دید کی مشتاق تھیں مگر۔ نہ جانے کہاں؟ میں عالمِ استغراق میں بہت دور آگے نکل آئی۔ جب محویت سے چونک کر دیکھا تو میں آخری سیرگاہ تک پہنچ چکی تھی۔ جو میرے گھر کے تقریباً دو میل دور تھی۔ یہاں اس وقت میلہ لگا ہوا تھا۔ لمبی لمبی خوشنما گھاس پر سُرخ سُرخ بنچ پڑے تھے۔ جن پر شوقین امیر زادے اور نازک بدن عورتیں سیر و تفریح میں مصروف تھیں۔ سورج حسرت بھری نگاہوں سے اہلِ دُنیا کے شور و شغب کو دیکھ رہا تھا۔ لیلائے شب شفق کی خونیں رتھ پر سوار، بڑے طمطراق سے آ رہی تھی۔ بڑے بڑے بھونرے پھولوں کے رس سے سیراب ہو کر دیپک راگ گانے لگے اور چاند سمندر کا سینہ چیر کر ابھرنے لگا۔

تھوڑی دُور ایک گوشے میں گھنا اور پھولدار کنج تھا۔ میں دم لینے کی خاطر اس کنج کی طرف لپکی۔ کنج کی سرور آمیز تنہائی میں ایک نوخیز جوڑا راز و نیاز کی باتیں کر رہا تھا۔ میں بہت کھسیانی ہوئی اور خفت مٹانے کے لئے پھولوں کی دیوار پھاند کر کنج کے پچھواڑے چلی گئی اس جگہ جھاڑیوں کی اوٹ میں ایک شرمیلا لڑکا کھڑا اس جوڑے کی باتیں سُن کر بغلیں بجا رہا تھا۔ کیونکہ اُسکی پشت میری جانب تھی

اُسے میرے آنے کا علم نہ ہوا۔ مجھے اس کی بیہودگی بہت ناگوار گزری۔ میں نے للکار کر کہا۔ "بدتمیز لڑکے یہاں کیوں کھڑے ہو"۔ اس آواز پر یکایک وہ میری طرف پلٹا۔ میں دھک سی رہ گئی۔ عجب اتفاق تھا۔ میں ایک ایسی ہستی کو اپنے بالمقابل دیکھ رہی تھی۔ جس سے ملنے کا اس دنیا میں امکان نہ تھا۔ آہ! میرے سامنے میرا عزیز ترین منوہر کھڑا تھا۔ ہوبہو منوہر۔ بالکل وہی سورج کی ہلکی ٹمٹماتی ہوئی آخری کرن اس کے بشاش چہرے کی بلائیں لے رہی تھی۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا "منوہر!"

میری آواز سن کر اُس نے جھرجھری لی اور پھر چپ چاپ ریتلے میدان کی طرف ہو لیا۔ اُسے یوں ہاتھ سے جاتے دیکھ کر مجھے تاب نہ رہی۔ میں محبت کے جوش میں منوہر منوہر کہتی اس کے پیچھے دوڑنے لگی مجھے بالکل بھول گیا کہ منوہر مر چکا ہے۔ وہ لڑکا بظاہر آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ مگر ہر قدم پر مجھ سے دُور ہونے لگا میں دیوانہ وار اُس کا تعاقب کر رہی تھی۔ اس ردوکد میں نہ جانے ہم کہاں سے کہاں چلے گئے۔ آبادی کا شوروغل جو ابھاٹے کی شوریلی اور گرجدار آواز میں مل کر رہ گیا۔

ایک کھاڑی کے قریب منوہر ریتلے ٹیلے پر چڑھنے لگا۔ میری طاقت نے جواب دے دیا۔ رفتار سست ہو گئی تاہم وہ ابھی سامنے دکھائی دے رہا تھا میں نے رو کر کہا "خدا کے لئے ذرا تو ٹھہر جا۔ میں ایک دفعہ تجھے جی بھر کر

دیکھ لوں ۔ میری اس التجا پر وہ ٹھہر گیا ۔ میں ہمت کر کے گرتی پڑتی ٹیلے پر چڑھ گئی وہ بالکل خاموش کھڑا تھا ۔ میں نے بے تابی سے پوچھا "بچے تم کون ہو ؟" وہ آہستگی سے بولا "منوہر" محبت و وارفتگی سے میری چیخیں نکل گئیں ۔ میں آغوش پھیلا کر اس کی طرف بڑھی مگر وہ تڑپ کر علیحدہ ہو گیا ۔ اور مری ہوئی آواز میں کہنے لگا "ماں تمہارا منوہر مر چکا ہے" ۔

میں لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گئی اور مایوسی سے کہا "پھر تم کون ہو ؟" وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا "ماں ان باتوں کو بھول جاؤ" ۔ میں نے کہا "تمہیں ایسا کہنے کا کیا حق ہے ۔ میں منوہر کو کیسے بھول سکتی ہوں وہ غمگین لہجہ میں کہنے لگا ۔ "تمہارے رونے دھونے سے منوہر کو بہت تکلیف ہو گی" ۔ اگر تم ایسا نہ کرو شاید تمہیں وہ کبھی کبھی ملتا رہے میں نے کہا "آہ ! وہ تو مر چکا ہے ۔ اب مجھے کیسے مل سکتا ہے" ۔ وہ کپکپائی ہوئی آواز میں کہنے لگا ۔ "وہ مرا نہیں بلکہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا" ۔

انتہائی مایوسی انسان کو خوش اعتقاد بنا دیتی ہے ۔ مجھے یاد آ گیا کہ اسکی قبر خالی تھی اور یہ منوہر ہی ہے ۔ میں نے ملتجیانہ انداز سے کہا ۔ منوہر خدا کے لئے مجھے پاگل نہ بناؤ ۔ تم کسی معجزانہ طور پہ زندہ ہو ۔ میں نے تمہاری قبر کھود کر بھی دیکھا ۔ تمہاری لاش غائب تھی مجھے سچ بتاؤ یہ کیا ماجرا ہے وہ بولا "اپنی زندگی کا راز کیسے بتاؤں ۔ ہاں یہ بتا سکتا ہوں کہ میں کسی وقت تمہارا منوہر ضرور تھا" ۔ میں

نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔"لیکن کیا اب منوہر نہیں ہو۔ وہ کہنے لگا۔" نہیں"
میں نے کہا "کیا تم منوہر کی رُوح ہو؟" وہ کہنے لگا۔"بالکل نہیں!" میں نے دوبارہ
کہا۔"پھر تم کون ہو؟" وہ بولا "ماں چلی جاؤ۔ اس پھیر میں نہ پڑو"۔ میں نے کہا۔
"منوہر! مجھے تم سے بے انتہا محبت ہے مگر تم مجھ سے اتنے بیگانے ہو گئے ہو"۔
وہ سنجیدگی سے کہنے لگا۔"ماں مجھے بھی محبت ضرور ہے۔ مگر میں تمہیں بھلا دینا
چاہتا ہوں تاکہ تمہاری محبت ایک دفعہ پھر مجھے انسانی زندگی پہ مجبور نہ کر دے"
میں نے کہا "منوہر اگر تم مجھے یہ راز بتا دیتے تو شاید میں مطمئن ہو جاتی"۔ وہ بولا
"چھوڑو ماں اس ذکر کو سن کر کیا کرو گی؟" یہ کہکر وہ گہری سوچ میں پڑ گیا۔
پھر یکایک کہنے لگا۔"اچھا اماں بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں ایک داستان سناتا ہوں"۔

(٦)

چاندی کی روپہلی کرنیں ریت کے نورانی ذرّوں پر مچل رہی تھیں۔ نقرئی چاندنی میں منعکس سمندر کی لہریں سیاہ فام چٹانوں کی ٹکر سے اس طرح پارہ پارہ ہو کر ہوا میں اڑتیں جیسے سمندر میں پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہوں۔ معتدل سمندری ہوائیں دھیرے دھیرے چل رہی تھیں۔ ہم دونوں ٹیلے کی ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

وہ کہنے لگا۔ آج سے سالہا سال پیشتر جبکہ دنیا گناہوں سے پاک اور دیوتاؤں سے پر تھی۔ وادی گنگا کی پاکیزہ سرزمین میں ایک خوبصورت مندر تھا۔

یہ ایک روحانی درسگاہ بھی جہاں عشق حقانی کا سبق ملتا۔ یہ وہ مے خانہ تھا جہاں مئے عرفان کے پیاسے روحانی تسکین حاصل کرتے۔ یہ پُر عظمت مندر دیوتاؤں کا مرکز تھا۔ اس مقدس مندر میں نلسی دیوی کی ایک حسین پجارن رہتی تھی خلوص و عقیدت مندی سے اس کی آواز میں ایسا رس پیدا ہو گیا کہ پوجا کے دوران میں جب وہ اپنی مترنم آواز میں معرفت حق کے گیت گاتی تو گنگا کا پانی رک جاتا۔ صبح کے ستارے کانپنے لگتے اور ہوا کی نبضیں بھی ساقط ہو جاتیں۔ وہ دیوتاؤں کی منظور نظر تھی۔ بلکہ خود دیوی تھی۔

بدقسمتی سے ایک نووارد یاتری اس کے پُر سوز شیریں آواز پر عاشق ہو گیا۔ پجارن کو اس عشق کا بالکل علم نہ تھا۔ اس کی ذات دنیاوی خواہشات اور لہو و لعب سے بالاتر تھی۔ پوجا کے وقت وہ نوجوان گل پیرہن جھاڑیوں اور صنوبر کے گنجان سایوں میں چھپ کر اُسے دیکھا کرتا جب وہ پوجا سے فارغ ہو کر واپس جاتی۔ تو وہ اسکی جدائی میں نقش پا کی طرح بیٹھ جاتا۔ ایک دن ایک دیوتا کا ادھر سے گزر ہوا یہ دیوتا شوخ اور زندہ دل تھا۔ اس نے اس کی آشفتہ حالی کی وجہ پوچھی۔ نوجوان نے اپنی داستانِ عشق کہہ سنائی۔

دوسرے دن پجارن نلسی کی پوجا کے لئے آئی۔ اس کے ہاتھ میں طلائی انگیٹھی تھی جس میں بڑے بڑے انگارے سُلگ رہے تھے۔ دوسرے ہاتھ میں سونے کا تھال تھا جس میں ہون کا سامان اور پھول وغیرہ رکھے تھے نلسی

کے قریب پہنچکر اس کے پاؤں لڑکھڑانے لگے - اس کا دِل بجھ گیا - وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی - نہ جانے اس کا پر عظمت دل کیا چاہتا تھا - یہ سب اُس دیوتا کے سحر کا نتیجہ تھا - پجارن کی بگڑی ہوئی حالت دیکھ کر اُس دیوتا نے قہقہہ لگایا اور بھاگ گیا - اچانک بدقسمت پجارن کی نگاہ صنوبر کے پیڑ میں چھپے ہوئے نوجوان پر پڑی - محبت کے اثر سے اُس پر مدہوشی طاری ہوگئی اور انگاروں سے لبریز انگیٹھی اُسکے ہاتھ سے گر گئی - یکایک دردناک چیخیں فضا میں گونج اٹھیں آناً فاناً تمام دیوتا جمع ہو گئے - تلسی کا پودا جھلس چکا تھا - جس سے پُردرد چیخیں نکل رہی تھیں -

دیوتاؤں نے تلسی کے پودے پر گنگا کا پوتر پانی چھڑکا اور اپنی اپنی سحرکار طاقتوں سے اُسے از سرِ نو ترو تازہ کر دیا - پجارن عبرتناک سزا کی مستحق تھی - اسکو ہلاک کر دینے کا فیصلہ ہوا تاکہ وہ مختلف جنموں میں دکھ بھری زندگی بسر کرے اور تلسی کو جلانے کی سزا میں ہر جنم میں اسکے سینے پر ایک ناسور رہے اس کے بعد اعلان کیا گیا جو اس پجارن سے ہمدردی کرے گا - وہ دیوتاؤں کی لعنت میں گرفتار ہو کر ذلیل و خوار ہوگا اس دیوتا کو جس کے سحر سے پجارن بے ہوش ہوئی تھی - اس فیصلے پر بہت ہی افسوس ہوا مگر دیوتاؤں کی سوگند سے ڈر کر خاموش رہا - چنانچہ بدقسمت پجارن سالہا سال تک مختلف جنموں میں دکھ جھیلتی رہی - ناسور برابر اس کے کلیجے پر موجود رہا -

موجودہ صدی میں پھر اس نے نیا جنم لیا۔ وہ بہت نیک اور خدا ترس تھی۔ اکثر محتاجوں اور بیواؤں کی دعائیں حاصل کرتی رہی۔ اُس نے دنیا کے تمام تیرتھوں کے درشن کئے۔ جن کی برکت سے ایک اندھے یوگی نے اُسے ایسا طریقہ بتایا۔ جس سے دوبارہ وہ تلسی دیوی کی خوشنودی حاصل کر سکے اندھا یوگی اس کی چارہ سازی کی بنا پر مجرم گردانا گیا۔ اور دیوتاؤں کے غیظ و غضب کا شکار ہو گیا۔ لیکن یوگی خود ایک زبردست طاقت کا مالک تھا۔ اس لئے اُسے صرف یہ سزا ملی کہ وہ اس دکھیا کے گھر جنم لیکر دس سال تک لباس ہستی میں رہے۔

اندھے یوگی کے فرمان کے مطابق اس عورت نے تلسی کا بیاہ رچایا۔ تلسی جی اُس سے خوش ہو گئیں تاہم وہ دیوتاؤں کو ناراض نہ کرنا چاہتی تھیں اس لئے انہوں نے تمہارے دل میں اس عورت کی ہمدردی پیدا کر دی اور تمہارے ذریعے اس دُکھیا تک ایک ایسے دیوتا کا کلام پہنچایا جس کی طاقت سب طاقتوں سے بلند تر تھی اُس کلام کی برکت سے اس عورت کو ہمیشہ کے لئے نجات مل گئی۔ مگر تم اُسکی ہمدردی کے جرم میں دیوتاؤں کی موردِ عتاب ہو گئیں اور تمہیں کئی سال تک بے اطمینانی کی زندگی گذارنی پڑی۔

اُس عورت کا ناسور دور ہوتے ہی اُسکے دوسرے دُکھوں کا بھی خاتمہ

ہو گیا۔ اس کا خاوند واپس آ گیا اسکے دو توام لڑکے پیدا ہوئے۔ جن میں ایک اندھا تھا۔ اور دوسرا آنکھوں والا۔ یہ اندھا لڑکا وہی یوگی تھا جس نے اس عورت کو تلسی جی کی خوشنودی کا راز بتایا تھا اور اب سزا کے طور پر اُس کے گھر پیدا ہوا تھا۔ اُس لڑکے سے تمہیں محبت ہو گئی۔ جس نے اپنی موت کے قریب پہنچ کر تمہاری محبت کے عوض اپنی سحر کار طاقت سے نیاز کا دل تمہاری طرف پھیر دیا۔ اور دوسری آنے والی مصیبتوں کو بھی رد کر دیا۔ پھر وہ یوگی سزا کی میعاد ختم ہونے پر بظاہر مر گیا۔ لیکن درحقیقت وہ مرا نہیں بلکہ اپنے اصلی روپ میں چلا گیا۔"

اس انوکھی داستان سے میں دریائے حیرت میں غرق ہو گئی تھوڑے وقفہ کے بعد وہ پھر بولا "ماں اندھا یوگی دراصل وہی دیوتا تھا جس نے کسی زمانے میں نوجوان بانتری کی حالت پر رحم کھا کر تلسی کی حسین پجارن کے دل پر عشق کا تیر چلایا تھا۔ میں نے گھبرا کے منوہر پر نظر ڈالی وہی معصوم چہرے والا منوہر کھڑا تھا۔ مگر اب اس کے خوبصورت سڈول شانوں پہ نورانی پر سایہ کئے تھے۔ اسکے گرد ایک نورانی ہالہ تھا اُس کے ہاتھ میں پھولوں کی ایک بانکی کمان تھی۔

اس کے ملکوتی تقدس اور پُر عظمت جلال سے مرعوب ہو کر میں نے اُسے تعظیم دی اور بے اختیار میری زبان سے نکلا "آہ! عشق کا دیوتا کامدیو اور میرا منوہر

ایک ہی ہیں"۔

سمادھ کا بھوت

کانگڑہ

جولائی ۱۹۳۷ء

میری طبیعت آج بہت بے چین تھی۔ میں ابھی تک شب خوابی کے لباس میں تھا۔ مجھے عاصم کے خط کا انتظار تھا۔ ہر چند اپنا دل دوسرے کاموں میں لگانا چاہتا مگر زلیخا کی یاد کچھ نہ کرنے دیتی۔ میری سب اُمیدیں عاصم کے خط سے وابستہ تھیں۔

——— میں اپنی زندگی کی بتیس منزلیں طے کر چکا تھا۔ اب تک کسی عورت نے میرے دل پر قبضہ نہ کیا تھا۔ عشق و محبت میرے نزدیک بے معنی الفاظ تھے۔ لیکن آہ برا ہو عاصم کا جو مجھے شکار کی غرض سے کرباچہ راہ ایک پہاڑی گاؤں میں اپنے ایک دوست

کے گھر لے گیا۔ جہاں میں اپنے میزبان چودھری کرامت کی لڑکی زلیخا کے تیر نگاہ کا خود شکار ہو گیا۔

زلیخا بحر حسن کا انمول موتی تھی۔ وہ اس وقت سترہ اٹھارہ سالہ دوشیزہ تھی مگر اپنے حسن و شباب سے قطعاً بے خبر زلیخا اپنے عالم باپ کی توجہ سے اردو فارسی میں کافی دسترس رکھتی تھی۔ اسی تعلیم کے اثر سے وہ دیہاتی لڑکیوں سے بالکل جداگانہ طبیعت کی مالک تھی۔

میں نے عاصم کے ذریعے چودھری کرامت کو رشتے کا پیغام دیا۔ جو اس نے نامنظور کر دیا۔ تاہم عاصم کے خطوط مجھے برابر آتے رہے اس کا خیال تھا کہ کرامت ایک شہری امیر زادے کو رشتہ دینے ہچکچاتا ہے۔ لیکن عنقریب ہی وہ رضامند ہو جائے گا۔

آج کئی دن سے عاصم کا خط نہ آیا تھا۔ اسی وجہ سے میں بہت مضطرب تھا۔ بارہ بجے کے قریب ملازم ایک لفافہ لایا۔ میرے دل کا کنول کھل گیا۔ مگر خط دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ خط عاصم کا نہ تھا۔ بلکہ میر صادق کی طرف سے دعوتی رقعہ تھا اُس نے رات کو مجھے کھانے پر مدعو کیا تھا

میر صادق کی کوٹھی میری کوٹھی سے ملحق تھی۔ وہ کوئی نوے سال کا بوڑھا آدمی تھا لیکن کاٹھی اچھی پائی تھی اُسے یہاں آباد ہوئے نصف صدی گزر چکی تھی۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا اُسے اسی حالت میں دیکھا۔ باوجود اس پیرانہ

ہمسائیگی کے ہمارا آپس میں میل جول نہ تھا۔ یوں تو بارہا پھاٹک سے گزرتے وقت میرا اس کا سامنا ہوتا۔ مگر معمولی صاحب سلامت کے سوائے اس نے کبھی مجھے بات چیت کا موقعہ نہ دیا تھا۔

میر صادق بہت بد مزاج چڑچڑا اور سخت گیر آدمی تھا اس کو آج تک کسی نے ہنستے نہ دیکھا تھا۔ لوگ اس سے نفرت کرتے تھے۔ عوام اس کو کافر کہتے تھے آج اسکی طرف سے دعوتی رقعہ پا کر مجھے سخت تعجب ہوا۔ میر صادق اور دعوت ان ہونی بات معلوم ہوتی تھی۔

رات کو وقتِ مقررہ پر میں میر صادق کے یہاں پہنچ گیا۔ اس نے دروازے پر میرا استقبال کیا۔ اسکی خشونت اور سخت گیری دور ہو چکی تھی۔ اور وہ حسنِ اخلاق کا دیوتا معلوم ہوتا تھا۔ وہ مجھے لائبریری میں لے گیا۔ جہاں تین اور مہمان بھی تھے۔ دو مہمانوں کو دیکھ کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

یہ چودھری کرامت اور اسکی لڑکی زلیخا تھے۔ تیسرا مہمان مسٹر اسحٰق تھا جو میر صادق کا مشیر قانونی تھا۔ یہ لوگ ایک گول میز کے گرد بیٹھے تھے وہ مجھے بڑی گرمجوشی سے ملے۔ اس سوسائٹی کو کچھ پُراسرار خیال کرتے ہوئے میں کھٹکا اور چپ چاپ کرسی پر بیٹھ گیا۔

مسٹر اسحٰق کچھ لکھ رہا تھا میرے دل میں سینکڑوں وسوسے اٹھ رہے تھے تھوڑی دیر بعد اسحٰق اپنے کام سے فارغ ہوا اور کاغذ میری طرف سرکا کر کہنے

لگا "میر صادق کی خواہش ہے کہ آپ انکی وصیت پر بطور گواہ کے دستخط کریں"۔
وصیت کا مضمون پڑھ کر مجھے معلوم ہوا کہ میر صادق اپنی تمام جائداد منقولہ وغیر منقولہ جس کی مالیت بیس لاکھ روپے ہے۔ زلیخا کے نام اس شرط پر وصیت کرتا ہے کہ وہ تمام عمر کنواری رہے ورنہ بصورت دیگر یہ تمام جائداد یتیم خانوں کو ملے دوسرا وہ اقرار نامہ تھا جو زلیخا کی طرف سے لکھا گیا تھا۔

نفس مضمون سے آگاہ ہو کر یاس و اندوہ سے میرا دل بیٹھنے لگا۔ میں نے دستخط تو کر دئے لیکن میری حالت ناگفتہ بہ تھی۔ میری تمام آرزوؤں کا خون ہو چکا تھا۔ وہ تمام ہوائی قلعے جو میں نے تیار کر رکھے تھے۔ چشم زدن میں مسمار ہو گئے۔ میرا اندر جیسے کہ ا رہا تھا۔ تاہم حوصلہ کر کے بیٹھا رہا۔

یہ کام ختم کر کے میر صادق ہمیں کھانے کے کمرے میں لے گیا۔ میز انواع و اقسام کی نعمتوں سے پر تھا۔ مگر مجھ سے ایک لقمہ بھی نہ اٹھایا گیا۔ میر صادق میری حرکات و سکنات کا بہ غور مطالعہ کر رہا تھا۔

کھانے کے بعد مسٹر اسحٰق رخصت ہوا۔ کرامت اور زلیخا بھی اپنے اپنے مخصوص کمروں میں آرام کرنے چلے گئے۔ ایک میں تھا کہ نقش پا کی طرح جوں کا توں جما رہا میرا دماغ مختل ہو رہا تھا۔ میں سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا کمرے میں مکمل سکوت تھا آخر میر صادق نے مہر خاموشی توڑتے ہوئے کہا "منیر" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ متانت سے بولا "مجھے معلوم ہے تم کس خیال میں ہو آہ یہ سب

کچھ میں نے معلوم زلیخا کی بہتری کے لئے کیا ہے۔ یہ ایک راز ہے جو تم پر ظاہر کر دینا چاہتا ہوں۔ کیونکہ مجھے کرامت کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ تم زلیخا سے شادی کے خواہشمند ہو" —— یہ کہتے ہوئے وہ میرے قریب کرسی سرکا کر بیٹھ گیا۔

(۲)

میر صادق کہنے لگا "بچپن میں مجھے اپنی پھپھی کی لڑکی سے محبت تھی اس لڑکی کا نام زلیخا تھا۔ میرا پھوپھا جاگیردار تھا۔ میری پھوپھی سے اسکی دوسری شادی تھی اسکی پہلی بیوی سے بہت سی اولاد تھی۔ مگر میری پھوپھی سے ایک ہی لڑکی تھی۔ میرے والدین فوت ہو چکے تھے پھوپھی نے ہی مجھے پرورش کیا تھا۔

زلیخا امیر آدمی کی لڑکی تھی۔ اور میں ایک یتیم لڑکا۔ لیکن آہ! محبت اندھی ہوتی ہے۔ میں اس پر پروانہ وار فدا تھا ۱۸۶۷ء میں جبکہ میں اٹھارہ سالہ نوجوان تھا۔ میرے پھوپھا کا انتقال ہو گیا۔ اُن کی موت کے بعد پھوپھی کے ساتھ سوتیلی اولاد نے بہت برا سلوک کیا۔ چونکہ اُن کو میرا بھی وہاں رہنا سخت ناگوار تھا۔ اس لئے میرے متعلق زلیخا پر تہمتیں تراشنے لگے۔

پھوپھی نہایت صابر تھی اُن کے سب ظلم وستم سہتی رہتی۔ مگر زلیخا کے ساتھ اُن کا حقارت آمیز سلوک برداشت نہ کر سکی اور گھر کو برباد کہہ دیا۔ پھوپھی نے اپنے زیورات بیچکر ہری پور کے علاقہ میں موضع کھوڑ کے قریب کچھ اراضی

خبر بدلی۔ ہم لوگ وہیں جھونپڑی بنا کر رہنے لگے اور اب اُس اراضی کی کاشت پر ہمارا گزارہ تھا۔

زلیخا مجھ سے پانچ سال چھوٹی تھی۔ جو چند سال میں ایک مکمل عورت بن گئی پھوپھی کو زلیخا کا بہت فکر تھا۔ ایک دن تنہائی میں وہ مجھے کہنے لگی "صادق تم دیکھتے ہو۔ میری صحت روز بروز گر رہی ہے۔ تم جوان آدمی ہو۔ اگر ہمت کرو تو ہماری مشکلیں آسان ہو سکتی ہیں" پھر میرے حلفیہ اقرار پر کہنے لگی "ہری پور میں میری ایک سہیلی رہتی ہے اُس کا خاوند ایک کمپنی کا حصہ دار ہے۔ یہ کمپنی مصر میں آثار قدیمہ کی کھدائی کا کام کرتی ہے۔ اگر تم مصر جا کر روپیہ کما لاؤ۔ تو تمہارے ساتھ زلیخا کا نکاح کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں"۔

پھوپھی کے ارادے سے آگاہ ہو کر ایک مسرت کی لہر میری رگوں میں دوڑ گئی۔ یہ وہ وقت تھا کہ ہمارے علاقہ میں کوئی ریل گاڑی کا نام نہ جانتا تھا۔ اور دس بیس میل بھی اکیلے سفر کرنا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ مصر جانا تو قطب نما کی مہم پر جانے کے برابر تھا۔ لیکن زلیخا سے وابستہ ہونے کے لئے مصر کا سفر کوئی سفر نہ تھا۔

میری مستعدی دیکھ کر پھوپھی بہت خوش ہوئی۔ اُسی دن پھوپھی نے مجھے تین سو روپیہ نقد اور ایک طلائی زنجیر دی۔ یہ روپیہ اور زنجیر میری ماں نے مرتے وقت پھوپھی کے پاس امانت رکھے تھے۔ تاکہ میں بڑا ہو کر کسی ضرورت کے

وقت کام میں لا سکوں۔ یہ زنجیر بہت بیش قیمت تھی اس کے درمیان ایک سورج مکھی کا پھول بنا ہوا تھا۔ جس پر قیمتی نگینے جڑے ہوئے تھے۔

دوسرے دن صبح سویرے باہر نکلا تو زلیخا نہایت مغموم چولھے کے پاس بیٹھی تھی۔ اُسکی صورت پر حسرت برس رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ میری جدائی کے غم نے اُسے نڈھال کر رکھا ہے میں بھی چپ چاپ اُسکے پاس جا بیٹھا اس نے اپنی بڑی بڑی سرمگیں آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ اسکی آنکھوں سے محبت کے چشمے اہل رہے تھے۔ آہ! اگر میرے پاس ہفت اقلیم کی دولت ہوتی تو اُن غم آلود نگاہوں پر تصدق کر دیتا مگر میرے پاس اس وقت سوائے ایک پر محبت دل کے اور کوئی چیز نہ تھی۔ جو میں بارگاہِ حسن میں پیش کر سکتا۔

اپنی ناداری اور مجبوری کو محسوس کر کے میری پیشانی عرق آلود ہو گئی میری آنکھیں بارِ ندامت سے جھک گئیں۔ یکایک مجھے اس زنجیر کا خیال آیا جو میری ماں کی نشانی تھی۔ میں دوڑا ہوا اندر گیا اور زنجیر لا کر زلیخا کے گلے میں ڈال دی اور کہا "زلیخا یہ ایک مسافر کی نشانی ہے اس کو اپنی منگنی کا تحفہ سمجھکر اپنے گلے سے جُدا نہ کرنا ــــ" زلیخا نے وعدہ کیا کہ وہ اس زنجیر کو اپنی جان ساتھ رکھے گی۔

اسی دن ہم لوگ ہری پور گئے۔ جہاں پھوپھی نے مجھے اپنی سہیلی کے خاوند کے سپرد کیا اور چند دنوں بعد میں اپنے سرپرست کی معیّت میں مصر کی مہم پر روانہ ہو گیا۔

مجھے ساتھ لے جانے والا بہت مہربان اور نیک آدمی تھا چھ مہینے تک میں اس کے پاس بطورِ ملازم کام کرتا رہا۔ مگر بعد میں اس نے مجھے ہر طرح قابل اور محنتی پاکر حصہ دار بنالیا۔ قسمت یاور تھی۔ میں خوب روپیہ کمانے لگا۔ ان دنوں ڈاک کا سلسلہ بھی محدود تھا۔ اس لئے کبھی کبھی مجھے پھوپھی کا خط ملا کرتا جس میں وہ میری کامیابی پر خوشی کا اظہار کرتی۔

تین سال بعد زلیخا کے ایک خط سے مجھے پھوپھی کے انتقال کی اطلاع ملی زلیخا نے لکھا تھا کہ میں گھبرا کر جلدی آنے کی کوشش نہ کروں۔ کیونکہ اس نے اپنی بوڑھی انّا کو اپنے پاس بلا لیا تھا۔ جو سگی ماں کی طرح اس کی حفاظت کر رہی تھی۔

(۱۳)

میں اپنا کام برابر سرگرمی سے کرتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ دن بھی آپہنچا کہ ہم اپنے وطن کو واپس لوٹے۔ گردش کے ایام گزر چکے تھے۔ میں اس وقت تین لاکھ روپے کا واحد مالک تھا۔ اپنی شاندار زندگی کے دلآویز نظارے میرے پیشِ نظر تھے خوشیوں سے بھری ہوئی دنیا میری منتظر تھی۔ میں زلیخا کو آغوشِ محبت میں لینے کے لئے بے قرار تھا ——— اس زمانہ میں بحری سفر بہت خطرناک ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ بہزار خرابی ہم لوگ کراچی پہنچے۔ یہاں میں نے زلیخا کے لئے قیمتی زیور اور خوبصورت کپڑے خریدے اور ہزاروں آرزوئیں دل میں لئے گھر

کو روانہ ہوا۔ ان دنوں ریل گاڑی صرف لاہور تک آتی تھی اور باقی سفر بہلیوں اور رتھوں کے ذریعے کیا جاتا تھا۔ جب میں سفر کی صعوبتیں سہتا ہوا ہری پور پہنچا تو معلوم ہوا کہ تمام علاقہ میں ہیضہ پھیلا ہوا ہے۔ ہزارہا جوان بوڑھے اور بچے اس وبا کی نذر ہو گئے۔ اس خبر سے میرا دل بجھ گیا۔ مجھے زلیخا کی فکر ہوئی۔ جس کی خیریت کی خبر مجھے ایک عرصہ سے نہ ملی تھی۔

گو میرا گھر یہاں سے پچیس میل کے فاصلے پر تھا مگر میں نے ہری پور میں گھڑی بھر دم نہ لیا اور وہاں سے چل دیا۔ راستے میں جو گاؤں ملتا سنسان گلی کوچے اجاڑ۔ کنوئیں جن پر پانی بھرنے والی پریوں کے جھرمٹ ہوتے تھے بالکل ویران پڑے تھے۔ تکیے جن میں چودھریوں کی محفل جما کرتی تھی۔ اور جہاں گاؤں کے بانکے ترچھے نوجوان خوش گپیاں ہانکا کرتے تھے، قبرستان کی طرح خاموش تھے۔ اس تباہی و بربادی سے میں کانپ اٹھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہیں زلیخا بھی اس وبا کی نذر نہ ہو گئی ہو۔

ساون کا مہینہ تھا اس سال برسات اس کثرت سے ہوئی تھی کہ کھیت اور میدان دریا بن رہے تھے۔ جس طرف نگاہ اٹھتی سوائے عالم آب کے کچھ دکھائی نہ دیتا۔ وبا پھیلنے کی بھی یہی وجہ تھی۔ کنوؤں کا پانی خراب اور ہوا زہریلی ہو چکی تھی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ ایک خاص قسم کی بھڑاس کھیتوں سے نکل کر فضا کو گندہ کر رہی تھی جس سے خود بخود طبیعت میں اضمحلال پیدا ہو رہا تھا۔ مجھے دور سے اپنی

جھونپڑی دکھائی دی۔ اُس کا دروازہ بند دیکھ کر میرا دل دھڑکنے لگا۔ مگر ساتھ ہی میری نظر بڑکے تناور درخت پر پڑی۔ اُس کے نیچے کوئی چارپائی پر سو رہا تھا۔ یہ زلیخا تھی۔

میں والہانہ اشتیاق سے آگے بڑھا۔ وہ اس ویرانے میں بے خبر سو رہی تھی اُسکے دراز مشکیں بال چارپائی سے نیچے گر رہے تھے۔ وہ سفید ڈھیلے ڈھالے لباس میں تھی اس کا دلکش چہرہ اترا ہوا تھا جس سے یاس و حرماں کے علامات ہویدا تھے۔ عالم خواب میں اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اُس کے سینے سے ایک ڈیڑھ دو سالہ بچہ لپٹا ہوا تھا۔

میں پُر محبت نگاہوں سے اسکے زاہد فریب حسن کا نظارہ کرنے لگا لیکن جونہی میری نظر اُس بچے کے چہرے پر پڑی میں دھک سے رہ گیا۔ اس بچے کی شکل ہو بہو زلیخا جیسی تھی۔ ذہنی اضطراب سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ آہ زلیخا نے مجھ سے بے وفائی کی یہ خیال اتنا اشتعال انگیز تھا کہ غیرت سے میرا خون کھولنے لگا میرے نزدیک زلیخا ایک آبرو باختہ عورت تھی۔ میں حالتِ غیظ میں زمین پر پاؤں ٹپکنے لگا۔

دفعتاً میرا پاؤں اس کی لٹکتی ہوئی زلفوں سے الجھا جس کی تکلیف سے وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ مجھے دیکھ کر ایک خوشی کی چیخ اُسکے منہ سے نکلی اور اپنے غمگین چہرے پر مسکراہٹ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ تعظیم کو اٹھی۔

اسکی ڈھٹائی پر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے تند لہجہ میں کہا "زلیخا! یہ بچہ کس کا ہے؟" وہ نہایت متانت سے بولی "اب یہ میرا ہی سمجھئے" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "ہاں یہ ہے، تو تمہارا بچہ۔ لیکن اس کا باپ کہاں ہے؟" وہ کہنے لگی "میں اسکی بابت کچھ نہیں جانتی۔ شاید وہ کوئی مسافر تھا" یہ کہتے ہوئے اُس نے بچہ گود میں لے لیا۔ جواب رو رہا تھا۔ بچے کو اسکی گود میں دیکھ کر مجھے تاب نہ رہی میں نے کڑک کر کہا "بے حیا لڑکی تو نے خاندان بھر کی ناک کاٹ ڈالی۔ تجھ پر اور تیرے آشنا پر جس کا تو نے یہ بچہ جنا ہے ابدی لعنت ہو"۔

میرے مُنہ سے یہ الفاظ سن کر وہ کانپ گئی اور سسکتی ہوئی آواز میں کہنے لگی "صادق خدا کے لئے یہ شرمناک الزام مجھ پر نہ لگاؤ۔ یہ بچہ تو مجھے کل ہی ملا ہے۔ اس سے پیشتر میں نے اُس کو دیکھا تک نہ تھا۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ ہمارے علاقہ میں سخت وبا پھیلی ہوئی ہے تمام علاقہ تباہ و برباد ہو گیا ہے چنانچہ میری انّا بھی جس کو میں نے امی جان کے انتقال کے بعد اپنے پاس بلا لیا تھا۔ اسی وبا کی بھینٹ چڑھ گئی۔

اب میں تنہا تھی، اس بیابان کے خوفناک سناٹے میں میرا دل سخت گھبراتا تھا۔ اس لئے میں قریب دیوار کے گاؤں میں جاکر دہانہ زدہ لوگوں کی خدمت کرنے لگی۔ کل میں تمام دن موضع سیف گل کے مریضوں کی دیکھ بھال کرتی رہی رات کو جب میں وہاں واپس آرہی تھی۔ تو راستے میں بارش نے آلیا۔ رعد کی

گرج اور بجلی کی چمک سے خوفزدہ ہو کر میں نے بھاگنا شروع کیا لیکن جب موضع کھوڑ کے قریب پہنچی تو بارش بڑے زور و شور سے ہونے لگی اور مجھے اس کی بوچھاڑ سے بچنے کے لئے اس اجاڑ بستی کے ایک تاریک گھر میں پناہ گزین ہونا پڑا۔

اس تاریک اور ہولناک فضا میں پریشان روحیں منڈلاتی معلوم ہوتی تھیں۔ ہر طرف ملک الموت کا تسلط تھا۔ قریب کے ایک گھر سے بادوباراں کے طوفان میں ملی جلی انسانی آہ و بکا کی آواز آ رہی تھی جس نے میرے خوف و ہراس میں مزید اضافہ کیا۔ میں آنکھیں بند کر کے دیوار کے سہارے بیٹھ گئی۔

بارش ختم کر مطلع صاف ہوا تو میں اس ڈراؤنے گھر سے باہر نکلی ابھی تک کسی بدنصیب کی آہ وزاری ختم نہ ہوئی تھی اس لئے میرے ضمیر نے گوارا نہ کیا کہ ایک دکھی کو ایسی حالت میں چھوڑ کر چلی جاؤں۔ چنانچہ میں اس ماتم کدہ کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی۔ اندر ایک کونے میں مٹی کا دیا جل رہا تھا سامنے ایک عورت کی نعش پڑی تھی۔ جس کے پاس ایک بوڑھا آدمی اس بچے کو گود میں لئے دردناک بین کر رہا تھا۔

یہ شخص انتہائی صدمہ سے پاگل ہو رہا تھا۔ اور عالم دیوانگی میں کہہ رہا تھا "سنیہ بالا" "سنیہ بالا" میں نے ظلم تم پر کیا تھا۔ مجھ سے قدرت اس کا انتقام لے رہی ہے میں نے تمہارا ایک بچہ چھینا تھا جس کے عوض یہ ماتما نے مجھ سے کئی بچے چھینے اور اب یہ میرا آخری بچہ جسے میں نے بڑی منتوں اور آرزوؤں سے پایا تھا میرے سامنے بلک رہا ہے۔

آہ! یہ صدمہ میرے لئے نہایت جاں گسل تھا۔ اے مظلوم سنتیہ بالا تجھے کہاں تلاش کروں۔ تیری رُوح امن وسکون کی غیر فانی دنیا میں پرواز کر رہی ہوگی۔ تمہیں کیا غرض کہ ایک بدعہد اور بد طینت کی گریہ وزاری سُنو۔ مگر نہیں سنتیہ بالا! بہت رحمدل تھی۔ وہ مجھے معاف کر دے گی۔ اور اس بے ماں کے بچے کو اس بچےّ کے عوض جو میں نے اس سے چھینا تھا لیکر میرے بارِ غم کو ہلکا کر دے گی۔" پھر وہ لگاتار سنتیہ بالا" سنتیہ بالا کہکر چلاّنے لگا۔ اُس بوڑھے کی حالت پر مجھے رحم آیا۔ میں اسکی دلجوئی کے لیئے اندر چلی گئی۔ مجھے دیکھکر بوڑھے کا مُنہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ بدحواسی کے عالم میں کہنے لگا"آہ! اے نیک سنتیہ بالا کی روح۔ آخر تمہیں میری حالت پر رحم آہی گیا۔ افسوس ہیں نے تمہاری قدر نہ کی میں نے کہا"بابا میں سنتیہ بالا نہیں۔ میرا نام زلیخا ہے۔ اور تمہارا داویلا سن کر آئی ہوں"۔ وہ بولا"نہیں نہیں میری نگاہ کبھی غلطی نہیں کرتی۔ تم اُسی کی رُوح ہو۔ پرماتما کیلئے میرے سب گناہ معاف کر دو۔ نیک روحیں کسی سے عناد نہیں رکھتیں۔ اور اس بچے کو لے جاؤ۔ یہ بچہ بالکل تمہارے بچےّ کا ہم شکل اور اسی عمر کا ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے بچہ میری طرف بڑھایا۔ میں نے اس مظلوم کا دل توڑنا پسند نہ کیا۔ اور بچے کو گود میں اٹھا کر گھر چلی آئی"۔

میں نے پیچ وتاب کھاتے ہوئے کہا۔ لیکن اس بچے کی شکل گواہی دے رہی ہے۔ کہ یہ تمہارا بچہ ہے۔ وہ لرز کر کہنے لگی۔ آہ! صادق۔ یہ بالکل اتفاق کی بات ہے ورنہ میں ہرگز نہیں جانتی کہ یہ بد نصیب بچہ کس کا ہے میں کڑے تیوروں سے زلیخا کو دیکھ رہا تھا۔ یکایک میری نظر اسکے گلے پر پڑی۔ میری دی ہوئی زنجیر اسکے گلے میں موجود نہ تھی۔ میں نے اسے جھٹلاتے ہوئے کہا" اگر تم سچی ہو تو میری دی ہوئی زنجیر گلے میں کیوں نہیں"۔

یہ سن کر اسکے ہوش اڑ گئے۔ اس نے بدحواسی سے گلے پر ہاتھ پھیرا اور

زنجیر نہ پا کر مُسکراتے ہوئے بچے سمیت میرے پاؤں پر گر کر بیہوش ہو گئی۔ میں نے حقارت سے اس کے سر کو پاؤں کی ٹھوکر سے پرے دے ٹپکا۔ اور وہاں سے چلا آیا۔ چند سال میں ہری پور میں مقیم رہا۔ مگر بعد میں آب و ہوا کی ناموافقت کی وجہ سے راولپنڈی چلا آیا۔ یہاں میں نے بہت سی اراضی خرید لی اور باقی روپیہ تجارت میں لگا دیا۔ اس واقعہ سے میرا مزاج سخت چڑچڑا ہو گیا اور خصوصاً عورتوں اور بچوں سے مجھے سخت نفرت ہو گئی۔

(۴)

اس شکستہ دلی کی حالت میں میں نے ساٹھ سال گزار دیئے۔ لیکن آج سے چند ماہ پیشتر مجھ پر ایک ایسے راز کا انکشاف ہوا جو میری زندگی کو بالکل بدل گیا۔

گذشتہ مارچ کو مجھے ایک دلال سے اطلاع ملی کہ موضع نور پور کے قریب ایک بیوہ کی بہت سی اراضی فروخت ہونے کو ہے۔ مجھے وہاں اراضی کی ضرورت تھی۔ اس لئے میں نے فوراً وہ زمین خرید لی۔ موضع نور پور ایک نہایت خوشنما گاؤں ہے جو ایک سرسبز شاداب خطہ میں واقع ہے۔

بہار کا موسم تھا۔ کھیتوں اور میدانوں کی گو سبزہ سے بھری ہوئی ننھی ننھی نونہالان چمن کی دھانی پوشاک آنکھوں میں سمائی جا رہی تھی خوشبودار پھولوں سے مزین جھاڑیوں پر بلا کا نکھار تھا۔ اشجار پر بہار شانِ بے نیازی سے کھڑے اپنی عظمت و جلال کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ایک طرف سیال چاندی کی طرح نورانی چشمہ فردوسی گیت گاتا ہوا بہہ رہا تھا۔

یہاں آ کر میرا دل بہت خوش ہوا۔ زلیخا کی جدائی کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ قدرت کی رنگینیوں نے میرے دل پہ اثر کیا۔ اور میں تقریباً ڈیڑھ ماہ تک وہیں رہ کر مشاہدہ قدرت سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

انہی ایام میں ایک دن میں اپنے مزارع کے ہمراہ اراضی کی دیکھ بھال کر کے واپس آ رہا تھا۔ شام کافی ہو چکی تھی۔ مگر ایک دھندلا سا اجالا ابھی تک چار سو محیط تھا۔ ایک موڑ کے قریب جہاں شاہراہ سے ایک راستہ گاؤں کیطرف گھومتا تھا۔ ہمارے گھوڑے رک گئے۔ میرا ساتھی کہنے لگا "یہ سمادھ والا موڑ ہے گھوڑے سوار سمیت آگے نہیں بڑھیں گے۔ میں نے وجہ دریافت کی تو اس نے بتایا کہ وہاں ایک بھوت رہتا ہے جسے دیکھ کر جانور آگے نہیں بڑھتے۔"

ہم دونوں نیچے اترے۔ میں نے قدم بڑھایا۔ تو فضا میں ہلکا ارتعاش اور دھیمی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ میرے ساتھی نے کہا۔ یہ سرسراہٹ اسی بھوت کے گزرنے سے ہوئی۔

میں گھر پہنچ کر تمام رات سوچتا رہا۔ کہ یہ کسی جانور کے پاؤں کی سرسراہٹ تھی۔ یا سچ مچ کوئی اسرار۔ دوسرے دن جب میں اپنے ساتھی سمیت وہاں سے گزر رہا تھا تو وہی سرسراہٹ پیدا ہوئی۔ میں نے اچھی طرح ارد گرد دیکھا۔ لیکن کوئی جاندار چیز دکھائی نہ دی۔

ایک دن میرا ساتھی بیمار تھا۔ میں کھیت پر اکیلا ہی مزدوروں سے کام کرواتا رہا۔ اس دن مجھے کافی دیر ہو گئی۔ میں واپسی پر تنہا تھا۔ قمری مہینے کی آخری راتیں تھیں۔ گویا بام فلک پر نورانی قندیلیں جگمگا رہی تھیں۔ تاہم ماہ منوّر کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ میں ٹارچ ہاتھ میں لئے اطمینان سے راستہ طے کر رہا تھا۔ جب سمادھ والے موڑ پر پہنچے تو پھر وہی سرسراہٹ سنائی دی میں بے پرواہی سے آگے بڑھتا گیا۔ یکایک قریب سے ایک دلدوز آہ سنائی دی۔ میں ایک لمحہ کیلئے رک گیا۔ میں نے دوبارہ قدم اٹھایا ہی تھا۔ کہ کسی نے پھر آہ بھری ان آہوں میں کچھ ایسا اثر تھا۔ کہ باوجود انتہائی خوف کے میرے پاؤں زمین سے نہ اٹھ سکے۔

یکایک مجھے اپنے سامنے چند قدم کے فاصلے پر ایک سفید اور لطیف سا دھواں دکھائی دیا۔ میں تعجب سے اس کو دیکھنے لگا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ دھواں سمادھ کی طرف بڑھنے لگا۔ جو دور ایک ویران باغ کے آخری کونے میں بنی ہوئی تھی۔ اس دھوئیں کا حرکت کرنا تھا۔ کہ خود بخود میرے پاؤں کو جنبش ہوئی۔ میں بغیر کسی ارادے کے اس طرف چلنے لگا۔ گو خوف سے میرا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ تاہم کوئی نامعلوم قوت مجھے اس طرف کھینچ رہی تھی۔ حتیٰ کہ میں بالکل اس پرانی سمادھ کے قریب پہنچ گیا۔ سمادھ کی عمارت بوسیدہ اور چاروں طرف سے بند تھی۔ جس کو برگد کے گنجان درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک پرانے زمانے کی باولی تھی جس کی ایک دیوار بالکل اس سمادھ سے ملحق تھی۔ وہ سفید سایہ سمادھ سے آگے بڑھ کر باولی کے قریب ٹھہر گیا۔ اور پھر آہوں کی آواز آنے لگی۔

یکایک وہ سایہ سیڑھیوں کے ذریعے باولی میں اترنے لگا۔ میں بھی کسی پُر اسرار کشش کے ماتحت اس کے پیچھے چلنے پر مجبور ہوا۔ شکستہ سیڑھیاں زنگ آلود ہونے کی وجہ سے چکنی ہو رہی تھیں۔ ہر قدم پر خطرہ تھا کہ اس زنگ پر سے پھسل کر تحت الثرای میں نہ گر جاؤں۔ لیکن گرتا پڑتا دو سو سیڑھیاں اتر کر پانی کے قریب آ گیا۔

یک دم وہ سایہ دیوار کے ساتھ ساتھ باولی میں چلنے لگا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا تو باولی کی دیوار کے ساتھ ایک چھوٹی سی روش بنی ہوئی تھی۔ جس پر ایک آدمی بمشکل چل سکتا تھا۔ اب چونکہ میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو چکا تھا۔ بادل ناخواستہ اس سایہ کے پیچھے روش پر

چلنے لگا۔ روش کے اختتام پر وہ سایہ غائب ہوگیا۔ میں نے سامنے والی دیوار پر روشنی ڈالی۔ تو ایک چھوٹا سا دروازہ دکھائی دیا۔ جو کسی زمانے میں اینٹوں کے جھرنے بنا کر چن دیا گیا تھا۔ مگر اب اینٹیں پانی کی نمی سے گل کر گر گئی تھیں اور دروازے میں شگاف ہوگیا تھا۔

میں دروازے کے اندر داخل ہُوا۔ یہ ایک چھوٹا سا تکون کمرہ تھا۔ جس کی ہوا کثیف اور بدبودار تھی۔ میں سمجھ گیا کہ میں اس وقت پرانی سمادھ کے پیچھے تہ خانے میں کھڑا ہوں۔ جس کی سیاہ اور کاہی آلود بالائی منزل برگد کے درختوں میں محصور ہے۔

سامنے کی دیوار میں ایک بالکل چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ نہ جانے کس طرح وہ کھڑکی کھول کر میں اندر گھس گیا۔ ٹارچ کی روشنی جب اس وسیع کمرے میں پڑی تو میرا خون خشک ہوگیا۔ پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ گو ٹارچ میرے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ تاہم اس کی روشنی کمرے میں اجالا کر رہی تھی۔ میں نے قریب کی دیوار کا سہارا لیا اور شدتِ خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔

دفعتاً مجھے آہوں کی آواز سنائی دی۔ اب کی مرتبہ ان آہوں نے میری ڈھارس بندھا دی۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں اکیلا نہیں بلکہ کوئی ہمدرد ہستی میرے پاس موجود ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے ٹارچ اٹھا کر اس چیز کو دیکھنے لگا۔ جس کے لئے

میں اتنا خوفزدہ ہو رہا تھا۔

یہ ایک بڑا سا مربع کمرہ تھا۔ جس کے عین درمیان میں ایک انسانی ڈھانچہ لکڑی کی ٹیک لگائے آسن مارے بیٹھا تھا۔ یہ ڈھانچہ بالکل بدھ مذہب والوں کی طرح اپنے استخوانی بازو اس لکڑی پر ٹیکے عبادت میں محو دکھائی دیتا تھا۔

میں واپس ہونے کو تھا کہ ڈھانچے کی ہڈیوں میں کھڑکھڑاہٹ پیدا ہوئی اور وہ ہلتا ہوا معلوم ہوا۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

(۵)

جب مجھے ہوش آیا تو میں اسی طرح تہ خانے میں پڑا تھا۔ مگر اب کمرے میں بجائے اندھیرے کے اجالا تھا۔ سورج کی روشنی اُن جھروکوں سے آ رہی تھی۔ جو چھت کے قریب باولی کی طرف بنے ہوئے تھے۔ میں خدا کا نام لے کر اٹھا۔ گو ڈھانچہ اب بھی موجود تھا۔ اور رات والی سب باتیں بھی یاد تھیں۔ لیکن دن کے اجالے میں خوف کسی حد تک دُور ہو چکا تھا۔ میں نے دل کڑا کر کے اس ڈھانچے کو دیکھا۔ اس کی استخوانی کمر میں ایک رسی بندھی ہوئی دکھائی دی۔ جس کے ساتھ ایک چھوٹا سا ٹین کا ڈبہ لٹک رہا تھا۔

اس ڈبے کو دیکھ کر مجھے بے انتہا حیرت ہوئی اور ڈبے کا راز دریافت

کرنے پر تل گیا۔ حالانکہ ڈھانچے کے قریب جاتے ہوئے میری روح فنا ہوتی تھی، تاہم میں نے جان پر کھیل کر وہ ڈبہ اس رسی سے کھول لیا اور بھاگ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

اب مجھے سیڑھیاں چڑھنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ میں مناسب جگہ پر پاؤں رکھتا ہوا اوپر چڑھ گیا —— گھر پہنچ کر سب سے پہلے میں نے اس ڈبے کو کھولا۔ اس کے اندر نیلے رنگ کی دھجی میں کچھ کاغذات بندھے ہوئے تھے۔ میں نے کاغذوں کو کھولا۔ تو کوئی سنہری سی چمکتی ہوئی چیز زمین پر گر پڑی اس کو دیکھ کر میرا رنگ فق ہو گیا۔ یہ وہی طلائی زنجیر تھی جو میں نے اپنی منگیتر زلیخا کو محبت کے تحفے میں دی تھی۔ اس زنجیر کو دیکھ کر میرا دل بہت آزردہ ہوا۔ میں نے خیال کیا کہ شاید یہ زنجیر مجھے اپنے رقیب کی کمر سے حاصل ہوئی ہے۔

میں زنجیر کو پکڑے اپنی بد نصیبی پر آنسو بہا رہا تھا کہ میری نظر ان کاغذات پر پڑی جن پر موٹی قلم سے کچھ لکھا ہوا تھا۔ میں نے انہیں پڑھنا شروع کیا یہ کسی کی داستانِ زندگی تھی۔ جس نے میری زندگی میں یکلخت انقلاب پیدا کر دیا۔

تحریر یوں شروع ہوتی تھی۔ میرا نام گوکل ہے۔ میں ۱۸۱۶ء میں پیدا ہوا۔ میرا باپ جاگیردار تھا۔ ہماری جاگیر سے ملحق ایک براہمن کی اراضی تھی۔

میرا باپ اس برہمن سے ناحق دشمنی رکھتا تھا اور اس کی اراضی میں بے جا دخل اندازی کیا کرتا۔ یہ عداوت کئی سال سے چلی آتی تھی۔ اس برہمن کے بیٹے گوپی اور نہال نہایت خوبصورت جوان تھے۔ میرا باپ اُن لڑکوں کو دیکھ کر بہت حسد کرتا۔

جب میں اٹھارہ سال کا ہوا۔ تو ایک نہایت اندوہناک واقعہ پیش آیا۔ اس سال فصل بہت اچھی ہوئی تھی۔ کسان بہت خوش تھے۔ میرا باپ مزدوروں سے کھیت کی کاشت کروا رہا تھا۔ ادھر برہمن بھی دونوں بیٹوں سمیت اپنا کھیت کاٹنے میں مصروف تھا۔ میرا باپ اُن لوگوں پر فقرے کستا رہا۔ بڈھا برہمن بالکل خاموش تھا۔ لیکن کہاں تک برداشت کرتا۔ تنگ آ کر وہ بھی ایک آدھ بات کا جواب دے بیٹھا۔ اس طرح بات طول پکڑ گئی اور دنگا فساد کی نوبت آ پہنچی۔

وہ صرف تین آدمی تھے۔ ادھر ہمارے کئی ملازم میرے باپ کے اشارے پر بے گناہ برہمنوں پر ٹوٹ پڑے اور چشم زدن میں ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ میرا باپ گاؤں کا سردار تھا۔ اس لئے بظاہر کسی کو بھی مخالفت کی جرأت نہ تھی۔ مگر درپردہ بہت سے لوگ ہمارے دشمن ہو گئے۔ بڈھی برہمنی کی حالت بہت پُر درد تھی۔ میرا باپ تو چاہتا تھا کہ اس کو بھی ٹھکانے لگا دیا جائے۔ مگر وہ اپنی لڑکی سمیت راتوں رات غائب

گئی ہے۔

اس واقعے کے دو سال بعد میرے باپ کو کسی نے قتل کر دیا۔ میرا چال چلن پہلے سے خراب تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد خوب دل کھول کر عیش و عشرت شروع کر دی۔ اس گناہ آلود زندگی میں سات سال گزر گئے

میری شادی باپ کی زندگی میں ہی ہو چکی تھی اور ابھی تک وہ بیچاری میکے میں بیٹھی میری جان کو رو رہی تھی۔ ماں میری آوارگی پر بہت کڑھتی اور ہمیشہ مجھے سمجھا بجھا کر اس فعل سے روکنے کی کوشش کرتی۔ مگر مجھ پر اس کی نصیحتوں کا کچھ اثر نہ ہوتا۔

میں نے ایک اچھوت عورت کو گھر ڈال لیا۔ میری ماں یہ ذلت کیسے گوارہ کر سکتی تھی۔ وہ اپنے بھائی کے گھر چلی گئی۔ پہلے میں نے کچھ پروا نہ کی لیکن جلدی ہی مجھے معلوم ہوگیا کہ ماں کے بغیر گھر کا انتظام اور بزرگوں کی شان نبھانا مشکل ہے۔ ادھر اس اچھوت عورت سے بھی جی بھر گیا تھا۔ اس لئے اب مجھے ماں کو منانے کی فکر ہوئی۔

دوار کا بھومی جہاں میری ننھیال تھی۔ یہاں سے چھبیں کوس کے فاصلے پر تھا میں نے سامانِ سفر درست کیا اور باپ کے وقت کے ایک بوڑھے ملازم کو ساتھ لے کر ماں کے پاس چلا گیا۔ ماں کا دل بھی مہر و محبت

۔ ۔ ۔ کا چشمہ ہوتا ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر باغ باغ ہوگئی۔ میں نے ماں کو گھر لانے کی بہت کوشش کی مگر ماموں نے اجازت نہ دی اس لئے کچھ دن مجھے یہاں ٹھہرنا پڑا ———— دوارکا بھومی ایک خوبصورت گاؤں تھا۔ میرا دل بھی وہاں لگ گیا۔ میں تمام دن اپنے پرانے یار دوستوں کے ساتھ سیر سپاٹے میں مشغول رہتا۔ یہاں سے کوس بھر کے فاصلے پر ایک ندی تھی۔ جہاں ہم لوگ اکثر سیر کو جایا کرتے تھے۔ ایک دن ہم سب ندی کے کنارے بیٹھے خوش گپیاں ہانک رہے تھے۔ ساون کا مہینہ تھا۔ بادل گھرے ہوئے تھے۔ پپیہا پی کہاں کی رٹ لگا رہا تھا۔ یکدم بارش ہونے لگی۔ میرا ایک دوست کہنے لگا۔ یہاں قریب ہی ایک برہمن کی جھونپڑی ہے چل کر وہاں پناہ لیں۔

ہم لوگ وہاں سے بھاگے تھوڑی دور نیم کے درختوں سے گھرے ہوئے کنج میں ایک جھونپڑی دکھائی دی۔ جھونپڑی کے دروازے پر ایک نور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی دوشیزہ کھڑی تھی۔ اس کی سیمیں کلائیوں پر کانچ کی نہایت کم قیمت چوڑیاں تھیں وہ نہایت غمگین تھی۔ اس کی مدبھری آنکھوں میں آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے دُرِ یتیم کی طرح جھلک رہے تھے اس کا توبہ شکن حسن وجمال باوجود اس افلاس کی بھی بے پناہ تھا۔ اس کے کندنی چہرے پر شاہانہ رعب وداب تھا۔ میں اس کے حسن سے مرعوب ہوگیا۔

اس لڑکی نے بڑے خلوص سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ میرے دوست نے

کہا ستیہ بالا بہن آج اتنی پریشان کیوں ہو؟" وہ بولی "بھیا! کیا بتاؤں، دادی کی صحت روز بروز گر رہی ہے۔ آج اُسے پھر تشنج کے دورے پڑ رہے ہیں۔"

میرے دوست نے مجھے بتایا کہ یہ دونوں دادی پوتی بہت غریب اور شکستہ دل ہیں۔ بوڑھی برہمنی دنیا سے متنفّر ہے۔ اس لئے آبادی سے دور رہتی ہے۔ اور نوخیز ستیہ بالا تمام دن کچے سوت سے جنئو تیار کرتی رہتی ہے جنہیں بیچ کر وہ شام کو اپنا اور اپنی دادی کا پیٹ پالتی ہے۔

بارش تھمنے تک ہم لوگ وہیں ٹھہرے۔ اور آتی دفعہ ازراہ ہمدردی سب نے ایک ایک جنئیو اس لڑکی سے خرید لیا۔ گھر پہنچ کر چپ چاپ میں بستر پہ پڑا رہا۔ اس لڑکی کی صورت میرے دل میں اتر گئی تھی۔ دوسرے دن صبح سویرے میں اکیلا ہی دل بہلانے کی خاطر ندی پر جا پہنچا۔

پگھلی ہوئی چاندی کی طرح چمکتی دمکتی ندی سورج کی اچھوتی کرنوں سے کھیلتی اور معشوقانہ انداز سے اِٹھلاتی ہوئی بہ رہی تھی۔ کناروں پر دور تک چھوٹے چھوٹے رنگین گھونگھے اور جگمگاتی ہوئی سیپیاں پھیلی تھیں۔ جن سے قوس قزح کے جلوے منعکس ہو کر انوکھی شان پیدا کر رہے تھے۔

دفعتاً چوڑیوں کی جھنکار نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ میں نے محویت سے چونک کر سر اٹھایا تو سامنے ستیہ بالا پانی بھرتی ہوئی دکھائی دی۔ میں دوڑ کر اس کے پاس گیا اور اس کی دادی کی خیریت دریافت کی۔ جب وہ پانی بھر

کر واپس جانے لگی تو میں بھی جنیئو خریدنے کے بہانے اس کے ساتھ ہولیا۔

اس دن سے میں ہر روز علی الصبح کسی نہ کسی بہانے ستیہ بالا کے ہاں جاتا اور اس کی دادی کی تیمارداری میں اس کی مدد کرتا۔ اسی طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ ستیہ بالا مجھ سے بہت مانوس ہوگئی۔

ایک دن موقع پاکر میں نے اس پر اپنی محبت کا اظہار کیا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا مگر اس کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ اس کا بدن جوش مسرت سے کانپنے لگا۔ اس کا ہر انداز ثابت کر رہا تھا کہ وہ بھی میری محبت میں سرشار ہے۔ اُسے خاموش پاکر میں نے پہلے سے زیادہ پرمحبت الفاظ میں شادی کی درخواست کی۔ وہ لجاتے ہوئے بولی۔ دادی کی زندگی میں مجھے اس انتخاب کا کوئی حق نہیں۔ اگر آپ ایسا چاہتے ہیں۔ تو دادی سے اجازت حاصل کریں۔

دوسرے دن میں ستیہ بالا کے ہاں گیا تو وہ پانی لینے ندی پر گئی ہوئی تھی اس کی دادی عبادت میں مشغول تھی۔ میں نے بوڑھی برہمنی کو پرنام کیا اس نے مجھے اشیرباد دی۔ میں نے اس کی خیریت کی خبر پوچھی۔ پھر ادھر ادھر کی باتیں کر کے حرفِ مطلب زبان پر لایا۔ وہ میری درخواست پر خوش تھی اتنے میں ستیہ بالا بھی آگئی۔ برہمنی نے اسے بلایا اور میری درخواست سے مطلع کرتے ہوئے اس سے دریافت کیا کہ وہ اس رشتے کو پسند کرتی ہے یا نہیں۔

ستیہ بالا نے شرماتے ہوئے دبی زبان سے ہاں کہدیا۔

اس کے بعد برہمنی نے میرا حسب ونسب دریافت کیا۔ جب میں نے اپنے باپ دادا کا نام بتایا تو غیظ وغضب سے برہمنی کا رنگ سیاہ ہو گیا وہ گرج کر کہنے لگی "دشٹ پاپی ملیچھ، یہاں سے دور ہو جا۔ تمہیں لوگوں کے ظلم وستم کی بدولت میں تباہ وبرباد ہوئی۔ تمہارے ہی ظالم باپ نے میرا سہاگ لوٹا اور میرے نوجوان بچوں کو تہ تیغ کیا۔ مجھے اور میری پوتی کو دربدر کیا۔ اب تم کس منہ سے ستیہ بالا کے رشتے کی درخواست کرتے ہو۔ اگر خیریت چاہتے ہو۔ تو فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔"

برہمنی کا جلال دیکھ کر میں کانپتا ہوا جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ باہر سے میں نے سنا وہ اپنی پوتی سے کہہ رہی تھی، "دیکھ! ستیہ بالا خبردار بھول کر بھی اس آدمی کا خیال دل میں نہ لانا۔ یہ اس باپ کا بیٹا ہے۔ جس نے تمہارے باپ دادا اور چچا کو بے گناہ قتل کیا۔" ستیہ بالا رو کر کہنے لگی "لیکن اس کا تو کوئی قصور نہیں۔ اگر گنہگار تھا تو اس کا باپ تھا"۔ برہمنی فیصلہ کن لہجہ میں کہنے لگی۔ "خاموش، یہ شخص ہرگز تمہارا شریک زندگی نہیں ہو سکتا۔ شاید میرے مرنے پر تم اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آجاؤ۔ اس لئے میں تمہیں متنبہ کرتی ہوں کہ کبھی اس کے دھوکے میں نہ آنا۔ یاد رکھو! اگر تم نے میری وصیت پر عمل نہ کیا تو تمہیں سہاگ کا سکھ نصیب نہ ہوگا اور ایک اناتھ برہمنی کا یہ سراپ

اس جنم میں تو کیا کسی جنم میں بھی تمہارا پیچھا نہ چھوڑے گا۔"

برہمنی کی باتوں سے مایوس ہو کر میں وہاں سے چلا آیا اور دوسرے دن ہی ماموں کی منت سماجت کر کے ماں کو لے کر اپنے گاؤں واپس آ گیا۔ یہاں آ کر میں نے بہت کوشش کی کہ ستیہ بالا کو بھول جاؤں لیکن یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔ ستیہ بالا کے لئے میری آتش شوق دن بدن بھڑکتی رہی۔

دوارکا بھومی میں دسہرہ کا تہوار بڑی شان و شوکت سے منایا جاتا تھا اب کی مرتبہ ماموں نے مجھے اور ماں کو اس تہوار پر بلاوا بھیجا۔ میں پہلے ہی موقع کا منتظر تھا جھٹ ماں کے ساتھ تیار ہو گیا۔ دوارکا بھومی آ کر مجھے اپنے دوست کی زبانی معلوم ہوا کہ بوڑھی برہمنی سرگباش ہو گئی ہے۔

دوسرے دن میں ڈرتے ڈرتے جھونپڑی کی طرف گیا۔ مہندی کے پودوں کے قریب ستیہ بالا پیکر یاس بنی ایک چٹائی پر بیٹھی تھی۔ میں اُسے دیکھ کر حیران رہ گیا وہ بالکل سفید موم کا مجسمہ معلوم ہوتی تھی۔ اس کے احمریں لبوں کی رنگت گو پھیکی پڑ گئی تھی۔ تاہم وہ ابھی تک حلاوت کی کان تھے۔ اس کے رخسارے اگرچہ زرد ہو رہے تھے۔ مگر اس کے بیضوی چہرے پر غم کی تاثیر سے غیر معمولی ملاحت ٹپک رہی تھی۔ اس کی مژگاں پر غم کی تاریکی چھائی ہوئی تھی مگر آنکھوں میں ایسی دلفریب چمک ہویدا تھی۔ جس کی تاب زاہد صد سالہ کے لئے بھی دشوار تھی۔

وہ مجھے دیکھتے ہی اپنی جھونپڑی میں چلی گئی اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ مگر اس کے اس سلوک سے میں مایوس نہ ہوا۔ اور ہر روز بلاناغہ وہاں جانے لگا۔ آخر میں نے اس پری کو شیشے میں اتار لیا۔ اس نے دادی کی وصیت توڑ دی اور مجھ سے شادی کر کے میری ڈگمگاتی ہوئی کشتیٔ حیات کو حسن کے پرمسرت ساحل سے لگا دیا۔

شادی کے بعد میری زندگی بہت طمانیت بخش تھی۔ لیکن میں اکثر اس کے لالہ گوں لبوں پر سرد آہیں محسوس کرتا۔ اور اس کی بادامی آنکھوں کو نمناک پاتا۔ میں ہمیشہ اس کی دلجوئی کے لئے کہتا "ستیہ بالا! مجھے تم سے ایسا عشق ہے جیسا بلبل کو گل سے" ان باتوں پر وہ بجائے خوش ہونے کے کانپنے لگتی کیونکہ دادی کی بد دعا کا اثر ابھی تک اس کے دل پر موجود تھا۔

شادی کے ایک سال بعد ستیہ بالا کو پرماتما نے بچہ دیا۔ بچہ بہت خوبصورت اور پیارا تھا۔ مجھے اب تک ستیہ بالا سے بدستور محبت تھی۔ مگر آہ! میرا یہ عشق ایک شیریں خواب ثابت ہوا۔ میری محبت کا مدہوش کن طلسم ایک گوالے کی لڑکی کی چشم پرفن نے آنِ واحد میں تارِ عنکبوت کی طرح توڑ دیا

ستیہ بالا میری اس کیفیت سے بالکل بے خبر تھی۔ لیکن جب میں گوالے کی لڑکی نندنی کو گھر لے آیا تو اس پر کوہ الم ٹوٹ پڑا۔ پھر بھی اس نے ماتھے پر شکن نہ ڈالی اور بدستور میری خدمتگذاری کو اپنا فرض سمجھتی رہی۔

نندنی ضدی اور پھوہڑ عورت تھی۔ وہ اُسے بہت دق کرتی اور ہر وقت لڑتی جھگڑتی رہتی۔ پھر اس کے خلاف الٹا۔ میرے اور میری ماں کے کان بھرتی۔ میری اماں پرانی عداوت کی وجہ سے پہلے ہی ستیہ بالا سے خوش نہ تھی۔ نندنی کے بھڑکانے سے وہ اور زیادہ خلاف ہو گئی۔ آخر ایک دن میں نے ستیہ بالا کا بچہ جو اب دو سال کا تھا چھین کر اسے گھر سے نکال دیا۔

میرے اس ظلم سے ستیہ بالا کا دماغ پھر گیا۔ اس کو تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ وہ گلیوں میں آوارہ پھرتی اور پاگل پنے میں نعرے لگا کر کہتی "سراپ سراپ" آخر ایک دن وہ غائب ہو گئی۔ میں خوش تھا کہ اس بلا سے چھٹکارا ملا۔ دوسرے دن ایک کنوئیں سے اس کی لاش برآمد ہوئی۔ اس نے خودکشی کر لی تھی۔

اُس کی موت کے کچھ عرصہ بعد نندنی نے بچے کو زہر دے کر مار ڈالا۔ بچے کی موت کا مجھے اور میری ماں کو بہت صدمہ ہوا۔ میں نے نندنی کو گھر سے نکال دیا۔ اور اپنے کئے پر پچھتانے لگا۔

مرد کے لئے رنج و غم عارضی چیز ہے۔ چند دن بعد مجھے یہ صدمہ بھول گیا۔ اب میں نئی شادی کی فکر میں تھا۔ مگر ماں میری پہلی استری کو لے آئی۔ اس استری سے میرے گھر تیرہ بچے پیدا ہوئے۔ یہ سب بچے دو سال کی عمر میں ماں کا دودھ چھوڑ دیتے اور بلک بلک کر مر جاتے۔ مجھے اور میری ماں

کو یقین ہو گیا۔ کہ یہ اُسی ظلم و ستم کا بدلہ ہے۔ جو ہم لوگوں نے ستیہ بالا پر کیا تھا تیرھواں بچہ پیدا ہوتے ہی میری استری گزر گئی۔

میری ماں کو پوتے کی بڑی آرزو تھی۔ اِس لئے وہ چاہتی تھی۔ کہ میں اور شادی کروں۔ مگر میرا دل اِن متواتر صدموں سے ٹوٹ چکا تھا۔ میں نے شادی کا خیال چھوڑ دیا۔ آخر جب میری ماں کا انتقال ہُوا اور گھر بالکل ویران ہو گیا۔ تو دوستوں کے کہنے سننے پر میں نے اخیر عمر میں پھر شادی کر لی۔ میری یہ استری بہت نیک اور فرمانبردار تھی۔ اس سے بھی یکے بعد دیگرے تین لڑکے پیدا ہوئے۔ لیکن اُن بچوں نے بھی دو دو سال کی عمر میں دودھ چھوڑ دیا اور گھُل گھُل کر مر گئے ——— ۱۸۵۷ء میں جب غدر ہُوا۔ تو کئی گھرانے تباہ و برباد ہو گئے۔ چنانچہ اس مصیبت سے میں بھی نہ بچ سکا۔ میری جاگیر چھن گئی۔ میں خانماں برباد ہو گیا۔ اور در در کی ٹھوکریں کھاتا پنجاب میں آ نکلا۔ یہاں موضع کھوڑ میں ایک ٹھاکر کے ہاں مجھے نوکری مل گئی۔ جہاں میں اپنی استری سمیت زندگی کے دن پورے کرنے لگا۔ میرے ہاں پھر ایک لڑکا پیدا ہُوا۔ جو بالکل ستیہ بالا کے بچے کا ہم شکل تھا۔

یہ بچہ خوب تندرست اور صحت ور تھا۔ مجھے خیال تھا کہ شاید بچ نکلے۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ جب یہ بچہ دو سال کا ہُوا تو تمام علاقہ میں ہیضہ کی وبا پھیل گئی۔ گاؤں کے گاؤں ویران ہو گئے۔ ہمارے گاؤں میں صرف

دو تین گھر ہنوز وبا کی دستبرد سے محفوظ تھے۔ باقی سب صفایا تھا۔

ایک دن شام کے قریب میری استری کی طبیعت خراب ہوئی اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے اندر اس نے پران تیاگ دیئے۔ طوفانی رات تھی۔ بادل خوب زور سے برس رہا تھا۔ لاش سامنے پڑی تھی۔ بچہ ماں کے واسطے بلک رہا تھا۔ اور دنیا میری نظروں میں اندھیر ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد بارش بند ہو گئی۔ میں نے دروازے سے جھانک کر دیکھا تو تمام گاؤں پر اندھیرا محیط تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ گاؤں میں اس وقت کوئی متنفس نہیں جو میری مدد کرے۔

اپنی بے کسی پر میرا دل سخت مجروح ہوا۔ میں چیخ چیخ کر آہ و بکا کرنے لگا۔ میں بار بار ستیہ بالا کی روح کو مخاطب کر کے اس سے معافی مانگتا اور اس کی روح سے التجا کرتا۔ کہ وہ اس وقت میری مدد کرے۔ میں گہرے جذبے اور عقیدتمندی سے ستیہ بالا کو پکار رہا تھا۔ یکدم دروازہ کھلا۔ اور ایک عورت اندر داخل ہوئی۔ جسے دیکھ کر میرے جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔ آنے والی عورت ستیہ بالا تھی۔ میں نے گڑگڑا کر اس سے التجا کی کہ وہ یہ بچہ لے کر میرے گناہ معاف کر دے۔

بچہ تو اس نے میرے ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ مگر کہنے لگی" بابا تمہیں دھوکا ہوا ہے۔ میں ستیہ بالا نہیں۔ میرا نام زلیخا ہے۔ یہ کہکر وہ بچے سمیت باہر نکل گئی۔ بچہ اس کی گود میں جاتے ہی خاموش ہو گیا۔ صبح اس جگہ سے جہاں وہ لڑکی کھڑی

تھی مجھے سونے کی ایک زنجیر ملی۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ وہ ستیہ بالا کی روح نہیں تھی۔ ضرور یہ کوئی نیک دل لڑکی تھی۔ جو پرماتما نے میری مدد کو بھیجی ——

—— میرے دل میں اس لڑکی کو ملنے کی زبردست خواہش تھی۔ تاکہ یہ زنجیر اُسے واپس دے دوں۔ مگر باوجود انتہائی تلاش کے اس لڑکی کا سُراغ نہ ملا۔ اب میرے سر پر کوئی بار تو تھا نہیں جس کی مجھے فکر ہوتی چنانچہ میں سادھو بن کر شہر بہ شہر قریہ بہ قریہ گھومنے لگا۔ مجھے دنیا سے کچھ دلچسپی نہ تھی البتہ یہ آرزو مجھے چین نہ لینے دیتی کہ کسی طرح یہ زنجیر اس لڑکی تک پہنچا دوں۔ آخر ایک دن مجھے الہام ہوا کہ سمادھی لگاؤں۔ اس زنجیر کا مالک خود میرے پاس آئے گا اور یہ امانت لے جائے گا۔ اب میں یہاں سمادھی لگائے رات دن ایشور کی یاد میں رہتا ہوں۔ شام کے وقت صرف دو گھنٹہ کے لئے موڑ پر اس زنجیر کے مالک کا انتظار کرتا ہوں۔ لیکن ابھی تک وہ الہامی وعدہ پُورا نہیں ہوا۔ شاید وہ میرے مرنے کے بعد یہاں آئے —— اگر اس کے آنے سے پیشتر میں مر گیا۔ تو میری روح وقت مقررہ پر موڑ کے قریب حسب دستور اُس کا انتظار کیا کرے گی۔

(۶)

یہ قصہ ختم کر کے میر صادق اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہنے لگا "یہ واقعات پڑھکر مجھے زلیخا کی مظلومیت کا یقین ہو گیا۔ اور اس صدمہ کو برداشت

نہ کرتے ہوئے دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ میری تمام رعونت اور سخت گیری آنکھوں کے راستے بہ گئی۔ میں اسی دن ہری پور پہنچا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ زلیخا خواہ میرے ساتھ کیسا ہی سلوک کرے۔ میں اس سے ضرور ملوں گا۔

مجھے بالکل خیال تک نہ آیا۔ کہ زلیخا اب پچاسی سالہ بڑھیا ہو گی۔ بلکہ یہی سمجھ رہا تھا۔ کہ میں اپنی نوخیز منگیتر سے صلح صفائی کرنے جا رہا ہوں، جیسا کسی زمانہ میں مصر سے آتے وقت کر چکا تھا۔ مجھے اپنی عمر کا بھی احساس نہ رہا۔ میں اسی شوق اور ولولے سے سفر کر رہا تھا۔ جب اُس جگہ پہنچا تو وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا پایا۔ اب یہاں ایک گاؤں آباد تھا۔ میں نے بمشکل برگد کے درخت اور کنوئیں سے جھونپڑی کا سراغ لگایا۔ اس جھونپڑی میں ان دنوں چمار رہتے تھے۔ میں نے اُن سے زلیخا کی بابت دریافت کیا۔ ایک بوڑھے چمار نے مجھے بتایا کہ وہ دونوں ماں بیٹا یہ جھونپڑی فروخت کر کے کرپا چوراہ میں آباد ہو گئے ہیں۔ اور زلیخا کا لڑکا چودھری کرامت کبھی کبھی اپنی اراضی کی دیکھ بھال کرنے آیا کرتا ہے۔

میں بادلِ ناخواستہ واپس لوٹا۔ اور لوگوں سے دریافت کرتا ہوا کرپا چوراہ پہنچا۔ چودھری کرامت سے ملاقات ہوئی۔ تو اُسے دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ کیونکہ وہ ایک سفید ریش آدمی تھا۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ وقت نے ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ چودھر کرامت وہی منحوس بچہ تھا۔ جس کی وجہ

رسے میں نے زلیخا سے قطع تعلق کیا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں اس کی ماں کا رشتہ دار ہوں اور اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ زلیخا کو مرے پچیس سال گزر چکے ہیں۔ اس خبر سے میں بہت آزردہ ہوا۔ دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ چودھری کرامت مجھے نہایت احترام سے اپنے دیوان خانے میں بٹھا کر خود کھانا لانے کی غرض سے زنان خانہ میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ پر آہٹ ہوئی۔ میں نے زمانہ گذشتہ کی یاد سے چونک کر دروازہ کی طرف دیکھا۔ حیرت و استعجاب سے میری چیخ نکل گئی۔ دروازے پر وہی نوخیز زلیخا ہاتھ میں کھانے کا طشت لئے کھڑی تھی۔ میری چیخ سے ڈر کر دہ مؤدبانہ طریقے پر کہنے لگی "باباجی میں آپ کے لئے کھانا لائی ہوں"۔ اتنے میں چودھری کرامت بھی آگیا۔ اور اُن دونوں نے میرے سامنے کھانا چن دیا۔

میں نے چودھری کرامت سے اس لڑکی کی بابت دریافت کیا۔ تو معلوم ہوا کہ وہ اس کی اکلوتی بیٹی ہے۔ جس کا نام اس نے اپنی ماں کے نام پر زلیخا رکھا ہے۔ شکل و صورت کے علاوہ اس لڑکی کی چال ڈھال، آواز غرضیکہ ہر انداز میری منگیتر زلیخا جیسا تھا۔ میں دیر تک اُس لڑکی سے گفتگو کرتا رہا۔ اور مجھے یقین ہوگیا۔ کہ یہ وہی زلیخا ہے جس نے اب کی مرتبہ چودھری کرامت

کے گھر جنم لیا۔ چنانچہ میں نے وہ طلائی زنجیر اس کے گلے میں ڈال دی۔۔۔۔ وہ لڑکی بھی مجھ سے مانوس ہو گئی۔ میں کئی دن اُن کے گھر مہمان رہ کر واپس چلا آیا۔ لیکن آج سے ایک ماہ پیشتر جب میں پھر اس لڑکی کو ملنے گیا۔ تو چودھری کرامت نے مجھے بتایا کہ راولپنڈی کا ایک رئیس جس کا نام منیر ہے۔ زلیخا کا رشتہ مانگتا ہے۔ اُس نے تمہارے متعلق بہت سی باتیں دریافت کیں معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ عنقریب ہی تمہاری درخواست منظور کرے گا۔ اس خیال سے کہ ایک نہ ایک دن اس کی شادی ضرور ہو گی مجھے سخت تشویش تھی۔

ایک دن جبکہ چودھری کرامت کہیں باہر تھا۔ موقع پا کر میں نے وہ ساری کہانی زلیخا کو سُنا دی۔ جو اُن کا غذات میں قلمبند تھی۔ اور آپ بیتی سنا کے اُس کے ذہن نشین کر دیا۔ کہ پہلے جنم میں وہ ستیہ بالا تھی جس نے دادی کی بد دعا سے گوکل کے ہاتھوں دکھ پایا۔ اور دوسرے جنم میں زلیخا کے رُوپ میں میری ذات سے تکلیف اٹھائی۔ اب پھر وہ تیسری مرتبہ دنیا میں آئی ہے۔ اور وہی دعا اس جنم میں بھی اس کو سہاگ کا سکھ نہ دیکھنے دے گی۔ چنانچہ اب اس کا واحد علاج یہی ہے کہ وہ عمر بھر شادی نہ کرے۔۔۔۔۔۔ زلیخا پڑھی لکھی سمجھ دار لڑکی تھی۔ وہ میری داستان سے اتنی خوفزدہ ہوئی کہ شادی کے نام پر لرزنے لگی اب مجھے یہ فکر تھی کہ اس کا باپ کہیں اُسے زبردستی بیاہ نہ دے۔ اس لئے انتہائی سوچ بچار کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنی تمام جائداد اُسے اس شرط پر

دے دوں کہ وہ تمام عمر کنواری رہے۔

یہ سب کچھ میں نے زلیخا کی بہتری کے لئے کیا ہے: تاکہ اُسے پچھلے جنم میں جو تکلیف میری طرف سے پہنچی ہے۔ اس کی تلافی کر سکوں۔

ایفائے عہد

گوالیار

دسمبر سنہ ۱۹۳۸ء

میں آگرہ سے سکندرہ جا رہا تھا۔ میرے دوست ڈاکٹر وسیم اور میرا پرانا ملازم کریم میرے ہمراہ تھے۔ کریم سکندرہ کے قرب و جوار کا رہنے والا تھا۔ ہمارا موٹر سکندرہ کے قریب ایک گورستان سے ہو کر گذرا ——— گورستان سڑک کی ایک طرف تقریباً فرلانگ تک چلا گیا تھا۔ شکستہ قبروں کے دردناک منظر سے متاثر ہو کر میں دم بخود بیٹھا تھا" مجھے ایک دفعہ اسی گورستان میں

میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔" کریم نے یکایک ہماری طرف مخاطب ہو کر کہا۔
وسیم کسی گہری سوچ میں تھا۔ چونکتا ہو کر بولا۔ "کیا کہا کریم!" کریم کہنے لگا۔" میں
یہاں قریب ہی ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتا تھا۔ یہاں میرے ننہال تھے
۔۔۔۔۔۔ یہ کسی زمانے میں شاہی گورستان تھا۔ اس کے اُس سرے پر ایک
تکیہ ہے۔ جس میں ایک بانوے سالہ فقیر رہتا تھا۔ گاؤں کے لڑکے اکثر اس سے کہانیاں
سننے آیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میں بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ شام کے بعد اس
سے کہانی سننے آیا۔ اور قصے کہانیوں میں ہمیں بہت دیر ہو گئی میرے دوستوں
نے صلاح کی کہ رات یہیں گزارنی چاہیئے ———— سردی شدت کی پڑ
رہی تھی۔ ہم لوگ تکیے کی نیچی چھت والی بے چراغ کوٹھڑی میں اپنے اپنے کمبلوں
اور لوئیوں میں دبکے ہوئے الاؤ کے قریب پڑے تھے گوبر کے دھوآں دھار الاؤ
سے آنکھیں نہ کھلتی تھیں۔ گورستان کی زہر آلود فضا کوٹھڑی کے اندر بھی اثر
انداز تھی۔ گوبر کے تلخ دھوئیں سے نتھنوں میں ہلکی سی جلن محسوس ہونے لگی۔
میں کمبل میں منہ لپیٹ کر سو گیا ———— آدھی رات کے قریب میری
آنکھ کھلی۔ تو ایک ایسی پُر ہول اور لرزہ خیز آواز سُنائی دی کہ میری رُوح تک کانپ
گئی۔ کوئی جاں بلب مریض کراہ رہا تھا۔ یا کوئی جاندار دم توڑ رہا تھا۔ سکرات موت
کی آخری خرخراہٹ بھی شاید اتنی خوفناک نہ ہو گی۔ ———— یہ آواز گورستان
سے آ رہی تھی۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے اپنے ساتھیوں کو جگایا۔ سب کے سب

اس لرزہ خیز آواز کو سن کر دہل گئے ——— گوبر کا بدبودار ایندھن جل کر بھسم ہو چکا تھا۔ الاؤ میں گرمی کی آخری رمق بھی مفقود تھی۔ اس قبر نما تاریک کوٹھڑی کے متعفن در و دیوار سے سردی پھوٹ رہی تھی۔ ہمارے دل سینوں میں بے چینی سے دھڑکنے لگے۔ تکیے کا فقیر ایک کونے میں گرم گدے کے بستر پر محو خواب تھا ہم نے اُسے بمشکل جگایا ——— وہ اٹھا اور دوبارہ الاؤ روشن کر کے دیوار کی ٹیک لگا کر اطمینان سے حقے کے لمبے لمبے کش لگانے لگا۔ خوفناک آواز برابر آ رہی تھی۔ ہم نے پوچھا یہ "آواز کیسی ہے؟" اُس نے ہنستے ہوئے جواب دیا "اس کی طرف بالکل خیال نہ کرو۔ ایسی آوازیں گورستان سے اکثر آیا کرتی ہیں۔ شاید کسی گنہگار رُوح کو عذاب ہو رہا ہے" اس بات سے ہماری نیند اور حرام ہو گئی۔ اور ہم رات بھر الاؤ کے قریب سہمے ہوئے آگ تاپتے رہے۔ پو پھٹنے کے قریب وہ بھیانک آواز بند ہو گئی۔ اُجالا ہوتے ہی ہم سب وہاں سے بھاگ آئے"۔

وسیم نے ایک پُرزور قہقہہ لگایا۔ "گورکن طبقہ بھی لوگوں کو مرعوب کرنے کے لئے کیسی کیسی روائتیں گھڑتا ہے" ایسے ویران مقامات پر رات کو اکثر بندر وغیرہ آوارہ پھرتے رہتے ہیں جن کی آوازوں سے یہ لوگ دوسروں کو ڈرا کر لطف اٹھاتے ہیں" ——— کریم روحانیت کا معتقد تھا۔ اُس نے مختلف دلیلیں پیش کر کے وسیم کو قائل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی رائے نہ بدلی میں بھی کریم کا ہمخیال تھا۔ اس لئے میں نے اسکی تائید کی آخر کار یہ طے پایا کہ کل رات ہم

تجربہ کیلئے اس پر اسرار مکئے میں رات بسر کریں۔

(۲)

دوسرے دن شام کے قریب ہم لوگ گورستان کی طرف روانہ ہوئے۔
گورستان شہنشاہ اکبر کے مقبرے سے میل بھر کے فاصلے پر تھا۔ اور کسی زمانے میں
اس سے بالکل ملحق ہو گا۔ تکیئے کا بوڑھا درویش ہنوز زندہ تھا۔ اس سے ہمیں
اس گورستان کے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہوئیں ہم نے اُسے انعام
دے کر اس بات پر راضی کر لیا۔ کہ وہ آج کی رات ہمیں اپنی کوٹھڑی میں جگہ دے
اور خود کسی دوسری جگہ رات بسر کرے —— سائیں کے جانے کے بعد
کریم نے کوٹھڑی صاف کی اور ایک طرف صف پر ہمارے بستر لگا دئے خزاں
کا ناساز موسم تھا۔ ہوا میں بے کلی اور فضا میں ایک درد انگیز تھرتھراہٹ تھی
رات کی سنسان تاریکی میں درختوں کی برہنہ شاخوں سے رہ رہ کر ایک ہوک سی
اٹھتی۔ دیئے کی روشنی کوٹھڑی کی سیاہ دیواروں میں جذب ہو کر رہ گئی تھی۔ ہم
چپ چاپ دم سادھے ہوئے بستروں میں پڑے رہے —— آدھی رات
کے قریب جبکہ تمام دنیا بحر ظلمات میں غرقاب ہو رہی تھی یکایک ایک مہیب
آواز نے ہمیں خوفزدہ کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ فرشتہ اجل کے پھنکارنے
کی آواز ہے یا داروغۂ جہنم کے اُن کوڑوں کی، جو کسی گنہگار رُوح پر برسائے جا رہے
ہوں۔ کریم اور مجھ پر خوف و ہراس طاری تھا۔ مگر وسیم پر بجائے خوف کے تعجب
کا عنصر غالب تھا۔ وہ جھٹ اٹھا اور ٹارچ ہاتھ میں لے کر باہر نکل گیا۔ ہم نے

اُسے جاتے ہوئے دیکھا۔ مگر اس کے ساتھ جانے کی جرأت نہ ہو سکی ــــــــــ تھوڑی دیر بعد وہ پھر واپس آیا اور کونے سے قبریں کھودنے والی کدال لے کر دوبارہ باہر جانے لگا۔ ہم نے بڑے اصرار سے اُسے روکا۔ لیکن وہ ضدی انسان راز کی تہ تک پہنچنے پر تلا ہوا تھا۔ بے پروائی سے کہنے لگا میری فکر نہ کرو۔ میں لاشوں کی صحبت میں بیٹھنے کا عادی ہوں ــــــــــ میں نے کدال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تاہم اس کام کے لئے یہ وقت موزوں نہیں۔ صبح کو دیکھا جائے گا۔ مگر وہ روکے نہ رکا۔ آخر کریم بھی ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔ اب میرے لئے تنہا یہاں رہنا دشوار تھا۔ جبراً و قہراً اُن کے ساتھ ہو لیا ــــــــــ

ہوا خوفناک آواز کی سرسراہٹ کے ساتھ ناگوار گونج پیدا کر رہی تھی۔ خشک پتوں کی چرمرٹ کی صدا سے رُوحوں کے چلنے پھرنے کا گمان ہوتا تھا۔ ایک ٹنڈ منڈ کے درخت کے سوکھے تنے کی کھوہ میں سوئے ہوئے گنجے سر والے گدھ روشنی پڑتے ہی لمبی لمبی گردنیں باہر نکال کر ہمیں دیکھنے لگے۔ ٹارچ کی جھلملاتی ضو میں ہمارے سائے لانبے اور ڈراؤنے ہو رہے تھے سہمی ہوئی فضا میں قبریں خوف سے سکڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ ہم محسوس کرنے لگے کہ مُردے اپنی بے نور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہمیں قبروں سے گھور رہے ہیں۔ اور ابھی اپنے استخوانی ہاتھ بڑھا کر ہمیں پکڑ لیں گے ــــــــــ اس تکلیف دہ خیال کے زیر اثر میں بار بار اپنے سائے سے ڈر کر اُچھلنے لگتا۔ مگر آفرین ہے وسیم پر وہ جانتا بھی نہ تھا کہ ڈر

کس کو کہتے ہیں۔ وہ بے کھٹکے قبروں کو روندتا ہوا ایک پرانی قبر پر جا کھڑا ہوا۔ اس قبر کا تعویذ جو کبھی پختہ تھا۔ میٹھے خربوزے کی طرح تڑخ کر پھوٹ چکا تھا۔ اس پر بے حد کاہی اُگ رہی تھی۔ وائیں طرف ایک خزاں رسیدہ جھاڑی تھی جس کی سوکھی ہوئی لمبی لمبی ٹہنیاں قبر پر پھیلی ہوئی تھیں۔ سرہانے کی طرف پتھر کی سل پر متوفی کا نام وغیرہ کندہ تھا۔ جو زنگ کی کثرت سے اس وقت نہ پڑھا گیا ——— یہ آواز اسی قبر سے آرہی تھی۔ وسیم اُسے کھودنے کی کوشش کرنے لگا۔ بہت جلد اُسے محسوس ہوا کہ یہ قبر جو بظاہر پھٹ کر شہد کے چھتے کی طرح کھوکھلی ہو رہی ہے۔ دراصل بہت مضبوط ہے۔ وہ جھاڑی کی سوکھی شاخیں ہٹا کر قبر کا کوئی کمزور حصہ تلاش کرنے لگا ——— یکایک اس کا پاؤں جھاڑی کی جڑ کے قریب ایک گڑھے میں جا پڑا اُسے ٹارچ سے دیکھا تو یہ ایک سوراخ تھا وسیم اس سوراخ کو سرگرمی سے کھودنے لگا۔ کدال کی ضرب پڑتے ہی وہ آواز یکدم بند ہو گئی۔ مگر دھن کا پکا وسیم اپنے کام میں مصروف رہا ——— کریم ٹارچ لئے کھڑا تھا۔ اور میں سوراخ سے نکلتی ہوئی مٹی کو کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پرے پھینک کر جگہ کو صاف کر رہا تھا۔ ایک گھنٹہ میں اُس نے سینڈھ کے ذریعے قبر کی داہنی طرف کی بنیاد اکھیڑ کر رکھدی۔ اس کے بعد اس نے پوری طاقت سے تعویذ کا خول اکھاڑ کر پرے دھکیل دیا ——— اب قبر ہمارے سامنے بالکل کھلی پڑی تھی۔ اُف! اُس دردناک نظارے سے ہمارے دل تڑپنے

لگے۔ قبر میں لاش کے قریب ایک نوزائیدہ بچہ پڑا ہوا مُردے کے پستان چوس رہا تھا۔ اس مردے کا تمام جسم مٹی ہو رہا تھا۔ مگر دونوں پستان تازہ دودھ سے بھرے ہوئے تھے ——— بچے کی شکل نہایت مکروہ تھی بے اختیار میرے منہ سے چیخ نکلی اور کریم بھی بھوت بھوت کہہ کر پیچھے ہٹا لیکن وسیم نے اُسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اور کوٹھڑی میں لے آیا ———

دیئے کی مسلسل روشنی سے گھبرا کر بچہ رونے لگا۔ اُس کی بھیانک آواز کوٹھڑی کی دھندلی دیواروں سے ٹکرانے لگی ہیں اور کریم اچک کر کونے میں جا گھسے۔ اُف یہ وہی آواز تھی۔ جو قبر کی تہ سے سنائی دیتی تھی۔ اس آواز میں اتنی کرختگی تھی کہ خدا کی پناہ۔ یہ ایک ننھے بچے کی آواز نہ کہی جا سکتی تھی ——— وسیم بھی پل بھر کے لئے بوکھلا گیا۔ تاہم فوراً ہی حواس درست کر کے بولا۔ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں اسے کچھ غذا دینی چاہیئے۔ یہ کہتے ہوئے اٹھ کر وہ ایک بھدے سے طاقچے میں رکھے ہوئے مٹی کے ٹوٹے پھوٹے برتنوں میں کوئی کھانے کی چیز تلاش کرنے لگا۔ آخر ایک برتن میں اُسے تھوڑا سا گھی مل گیا۔ جو اس نے اس بچے کو چٹایا اور بچے نے رونا بند کر دیا۔ ہم نے رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ صبح سویرے سائیں کے آنے سے پیشتر ہی میں اور کریم گورستان میں گئے اور رات کی اکھڑی ہوئی قبر کے تعویذ کا خول بدستور قبر پر رکھ کر سبندھ کو اس مٹی سے بھر دیا۔ جو رات کو وہاں سے نکالی گئی تھی ——— سرہانے کی طرف لگی ہوئی سل سے متوفیہ کا نام وغیرہ

پڑھنا چاہا۔ حروف زنگ کی تہوں سے بالکل معدوم ہو چکے تھے۔ میں نے رومال پانی میں بھگو کر اُن پر رگڑا۔ آخر کار بڑی مشکل سے شمس النہار پڑھا گیا باقی حروف نہ پڑھے جاتے تھے ـــــــــ جب ہم لوگ واپس کوٹھری میں آئے تو وسیم بولا "ہمیں سائیں کے آنے سے پیشتر ہی یہاں سے چلا جانا چاہیئے۔ سائیں کو اس بچے کی برآمدگی سے مطلع کرنا اچھا نہیں"۔ میں نے کہا۔ "چھپانے سے کیا فائدہ؟" وہ بولا اگر کسی کو معلوم ہو گیا۔ تو یہ بات مشہور ہو جائے گی۔ اور تمام دنیا اُسے دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑے گی۔ اس طرح یہ بچہ مر جائے گا"۔ میں نے کہا" اس بچے کا پالنا خطرے سے خالی نہیں"۔ وہ بولا کیوں؟ کیا تم نے اپنی بڑی بوڑھیوں سے بچپن میں کبھی نہیں سُنا۔ کہ کئی لوگوں کو گورستانوں سے ایسے بچے دستیاب ہوتے۔ جو حاملہ عورتوں کی میتوں نے قبروں میں جنے تھے" میں نے کہا۔" وہ تو محض روائتیں ہُوا کرتی ہیں بھلا ایسی باتوں پر کوئی یقین بھی کر سکتا ہے"۔ وسیم کہنے لگا۔" لیکن ایسی صورت میں جبکہ یہ روایت ہمارے سامنے عملی جامہ پہن چکی ہے۔ خواہ مخواہ قائل ہونا پڑتا ہے"۔ ایک ڈاکٹر کی زبان سے یہ الفاظ سن کر میں لاجواب ہو گیا ـــــــــ اس کے بعد وسیم بچے کو لیکر باہر نکل گیا۔ اور ہم سائیں کے آنے تک وہیں ٹھہرے۔

(۱۳)

وسیم نے اس بچے کا پالنا جتنا آسان سمجھ رکھا تھا۔ اتنی ہی دشواریاں پیش

آئیں۔ وہ بچہ کریم کے سپرد کیا گیا۔ مگر وہ بھی اس ذمہ داری کو نبھا نہ سکا۔ آخر کار اُسے ایک بے اولاد بیوہ کی گود میں دے دیا گیا۔

اس بچے کا نام صفدر رکھا گیا۔ اس کے کفیل ہم لوگ تھے۔ وہ اس غریب بیوہ کی زیر نگرانی پرورش پاتا رہا۔ چند ماہ کے اندر اس بچے کی شکل اتنی تبدیل ہو گئی کہ پہچانا نہ جاتا تھا۔ اس کے پچکے ہوئے گالوں نے گوشت سے پُر ہو کر اُسے حسین بنا دیا۔ اس پری زاد بچے کی بڑی بڑی اور لمبی آنکھیں خاص طور پر خوبصورت اور چمکیلی تھیں۔ مجھے اور کریم کو بہ نسبت وسیم کے اس بچے سے زیادہ اُنس ہو گیا ——— یہ بچہ حیرت انگیز طور پر نشوونما پا رہا تھا۔ بچے کے دماغ میں پیدائشی نقص تھا۔ دو برس کا ہوا تو غریب بیوہ کو شکایت رہنے لگی کہ بچہ نہایت تند مزاج ہے۔ جس گلاس سے وہ پانی پی لے وہ اس میں خود پانی نہیں پیتا اور اُسے اپنے برابر بیٹھنے نہیں دیتا ——— وہ چار سال کا ہوا تھا کہ وہ بیوہ فوت ہو گئی۔ اب اُسے دوبارہ کریم کے سپرد کیا گیا۔ گھر لانے پر ہمیں اس کے عادات و اطوار کا صحیح اندازہ ہو گیا۔ جس طرح اس کی ہستی پر اسرار تھی۔ اسی طرح اس کے عادات و اطوار بھی نرالے تھے۔ وہ اُجلے اور بھڑکیلے کپڑوں کا شائق اور عطریات کا عاشق تھا ——— جب تک دسترخوان پر بہت سے کھانے نہ ہوں۔ وہ خوش نہ ہوتا۔ ہمیشہ اپنی ٹوپی میں کسی پھول یا پرندے کا پر لگاتا اور گاؤ تکیے کے سہارے تنہا بیٹھ کر کچھ سوچا کرتا۔ وہ قدرتاً شاعر اور حاضر

جواب تھا۔ دس بارہ سال کی عمر میں اچھے شعر کہنے لگا۔ تعلیم کی طرف راغب نہ ہُوا اس کی طبیعت میں فیاضی اس درجہ تھی کہ جب کبھی بھنگی اُسے سلام کرتا تو اُسے گھر کی چیزیں اٹھا کر انعام میں دے دیتا۔ اس کے یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر ہم اُسے صفدر جنگ کہنے لگے۔ (یہاں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ صفدر کو ہم نے اس کے پُر اسرار حالات سے بالکل ناواقف رکھا تھا۔ اور اس سے اس کے متعلق کسی قسم کا ذکر نہ کرتے تھے۔ انہی ایام میں ایک رات کو کریم میرے پاس بوکھلایا ہُوا آیا۔ اور گھبرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا "آقا صفدر کو کوئی عارضہ ہو گیا ہے۔"

——— میں گھبراہٹ میں ننگے پاؤں دوڑتا ہُوا صفدر کے کمرے میں گیا۔ صفدر کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح کمرے کی دیواروں کے ساتھ ساتھ نہایت تیزی سے گھوم رہا تھا۔ میں نے اُسے پکڑنے کی کوشش کی مگر یکایک کریم کی چیخ سن کر رُک گیا ——— کریم نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ اُف پناہ بخدا! دیوار پر صفدر کے دو سائے پڑ رہے تھے۔ دیر تک اُس کی یہی حالت رہی پھر یک دم ایک سایہ غائب ہو گیا اور صفدر بے ہوش ہو کر گر پڑا ——— صبح میں نے وسیم سے جا کر اس واقعہ کا ذکر کیا۔ اُسے بھی بڑا تعجب ہُوا۔ ہم کئی دن اس واقعہ پر غور کرتے رہے۔ لیکن کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے ———

——— یہ واقعہ ہفتے کی رات کا تھا۔ دوسرے ہفتے کی رات کو دفعتہً

پھر اس کی طبیعت بگڑ گئی اس کے سائے دو ہو گئے۔ اور وہ کمرے میں گھومنے لگا ——— اس کے بعد صفدر کی ہر ہفتے کی رات یہ حالت ہونے لگی۔ ہم نے بہتیرے علاج معالجے کرائے۔ عاملوں کی طرف رجوع کیا۔ دم جھاڑے ٹونے وغیرہ کئے لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا ——— ایک دن وسیم میرے پاس آیا۔ اس نے مجھے ایک عجیب خبر سنائی۔ وہ کہنے لگا شہر کے مشہور رئیس دیوان بندرابن کو آسیب ہو گیا ہے۔ ہر ہفتے کی رات کو اس کے دو سائے ہو جاتے ہیں اور وہ پاگل پنے میں ایک لکڑی کے صندوق سے ٹکریں مار مار کر بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ اس خبر نے مجھے عجیب مزید حیرت میں ڈال دیا۔ ہم دونوں اُسی دن دیوان صاحب کے گھر پہنچے دیوان بندرابن ایک قدیم راجپوت خاندان کے آخری نام لیوا تھے۔ وسیم سے اُن کی پرانی صاحب سلامت تھی۔ وہ بہت خوش اخلاقی سے ملے مگر اُن کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ دیر تک اُن کی بیماری کے متعلق باتیں ہوتی رہیں وسیم نے صفدر کا ذکر بھی شروع کر دیا۔ اور اس کی تمام داستان انہیں کہہ سنائی یکایک مجھے ایک خیال آیا۔ ”دیوان جی میں وہ صندوق دیکھنا چاہتا ہوں۔ جس سے ٹکریں مار کر آپ بیہوش ہو جاتے ہیں۔“ میں نے کہا ”آپ شوق سے دیکھ سکتے ہیں“۔ دیوان صاحب بولے ”اس میں پرانے زمانے کی چند تحریروں اور اسلحہ کے علاوہ کچھ نہیں“ ——— دیوان صاحب ہمیں گھر کے

اندرونی حصّہ میں لے گئے۔ جہاں ایک پرانی طرز کے دالان نما کمرے کے ایک کونے میں لکڑی کا بہت بڑا پرانا صندوق رکھا تھا جس پر قدیم ساخت کا سُرخ چمکیلا روغن کیا گیا تھا۔ اور جا بجا پیتل کے بڑے بڑے پھول اور پتریاں جڑی ہوئی تھیں۔ دیوان صاحب نے صندوق کھولا۔ اس کے پہلے دو خانوں میں اُن کے آباؤ اجداد کا سپہ گری کا ساز و سامان اور وردیاں رکھی تھیں اور نچلے خانے میں پرانے تمسک دستاویزیں اور دوسرے کاغذات بھرے تھے۔

ہم دیر تک اُن کاغذات کا معائنہ کرتے رہے لیکن ہمیں کوئی ایسی چیز دکھائی نہ دی جو ان واقعات پر روشنی ڈال سکتی۔ آخر دیوان صاحب صندوق بند کرنے کو تھے کہ اوپر کے خانے میں مجھے ایک زرد و زطلاء دانی نظر آئی۔ میں نے اُسے اٹھا کر کھولا۔ اس میں دو خط ایسے دستیاب ہوئے جو کبھی حنائی رنگ کے کاغذ پر لکھے گئے تھے۔ مگر اب خاکستری ہو رہے تھے

خط کی طرز تحریر زنانہ تھی۔ ایک خط کا مضمون تھا۔

میری غمگسار بہن سکھ ورشا دیوی

تسلیم! میں آپ کے ارشاد کے مطابق راکھی لیکر دیوان تلک کل راج جی کے پاس گئی، انہوں نے جس ہمدردی اور جاں نثاری کا ثبوت دیا، وہ میرا دل ہی جانتا ہے

وہ جتنے بہادر ہیں اُتنے ہی رحمدل بھی ہیں انہوں نے جان پر کھیل کر

مجھے اپنے پتی سے ملایا۔ آہ! اپنی دیو کی حالت دیکھ کر غم سے میرا دل پھٹ گیا وہ بالکل پہچانے ہی نہیں جاتے اُن کی شہزادگی فقیری میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اُن کی صحت بھی نہایت خراب ہے۔ بھلا شاہی محلات میں عیش و عشرت کے خوگر شہزادے کو قلعہ گوالیار کے تنگ و تاریک تہ خانے کی ہوا کیسے راس آتی مجھے کیا معلوم تھا۔ کہ میرے سنہرے خوابوں کی یہ دلشکن تعبیر ہو گی کہ میں پتی دیوتا کو بجائے تخت نشین ہونے کے خاک نشین دیکھوں

کاش ! ہمارے دن پھر بدل جائیں۔ مگر نہیں یہ خیال عبث ہے بھائی کی سنگ دلی پر اُن کا دل ٹوٹ چکا ہے اب وہ ملک گیری کی ہوس میں انسانی خون بہانے سے سخت متنفر ہیں اب اُن کے دل میں صرف یہی آرزو ہے۔ کہ اُن کا لاشہ بجائے تہ خانوں میں سڑنے کے اُن کے آباؤ اجداد کی لاشوں کے پاس دفن ہو۔ میں اس وصیت کو پورا کرنے کا مقدس اگنی کنڈ پر قسم اٹھا کر اُن سے عہد کر چکی ہوں۔ اب اس قسم کی ادائیگی مجھ پر فرض ہے اگر میری عمر نے وفا نہ کی۔ تو شہزادہ مراد کا وہ بچہ جو میرے پیٹ میں ہے میری قسم پوری کریگا۔

فقط

پر بھاوتی عرف شمس النہار بیگم

شمس النہار کا نام پڑھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مجھے اس قبر پر لکھا ہؤا نام یاد آ گیا۔ جس سے صفدر بر آمد ہؤا تھا۔ میں نے بیتابی سے دوسرا

خط اٹھایا اُس میں لکھا تھا۔

ہمدم و ہمراز سکھ ورشا دیوی

موت مجھ سے ہم آغوش ہو رہی ہے۔ وقت کی تند ہوا میرا چراغ ہستی گل کرنے کے درپے ہے۔ میں ابھی تک اُس کا سختی سے مقابلہ کر رہی ہوں مجھے بچہ جننے کا انتظار ہے تاکہ میں اُسے خیر و برکت دے کر دُنیا سے رخصت ہو جاؤں۔ آہ پیدا ہونے کا وقت بہت دُور ہے —— موت کہاں تک مجھ سے رعایت کرے گی۔ کیا یہ بچہ میرے ساتھ ہی قبر میں جائے گا۔ اور اس طرح ایک ایسی ہستی بھی تلف ہو جائے گی جس پر ایک مظلوم شہزادہ کی وصیت اور ایک ناشاد راجپوتنی کی قسم کا دار و مدار تھا۔

مگر نہیں۔ نہیں میرا بچہ نہیں مر سکتا جب تک میری قسم پوری نہ ہو خواہ میری رُوح کو سخت سے سخت عذاب ہی کیوں نہ بھگتنا پڑے میری قوتِ ارادی اُسے زندہ رکھے گی۔ اور اس سے یہ قسم جبراً پوری کرائے گی ——"

ان عجیب و غریب خطوط نے میرے جسم میں لرزہ ڈال دیا۔ میں نے وہ خط وسیم اور دیوان صاحب کو پڑھ کر سنائے۔ گیا صفدر وہی بچہ ہے۔ میں نے حیرت و استعجاب سے کہا —— وسیم نے زوردار لفظوں میں اس کی تردید کرتے ہوئے کہا۔ یہ قطعاً ناممکن ہے آپ کچھ خیال تو کریں۔ یہ خط آج سے تین سو سال پہلے شہزادہ مراد کی بیگم نے لکھا تھا۔

تین سو سال تک اس بچے کا قبر میں زندہ رہنا پھر ایک نوزائیدہ بچے کی صورت میں قبر سے نکلنا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا کسی مُردے کا جی اٹھنا۔" یہ بات کسی رُوحانی طاقت یا قوتِ ارادی سے کچھ بعید نہیں"۔ دیوان صاحب نے کہا۔ اوّل تو قبر میں بچہ پیدا ہونا ہی کیا کم حیرت انگیز ہے جو آپ اس امر سے انکار کرتے ہیں ——— یہاں ممکن اور ناممکن کا سوال ہی فضول ہے جہاں تک میرا خیال ہے یہ وہی آسیب زدہ بچہ ہے جو اس خط کی راقمہ نے قبر میں جنا۔ اب تک وہ کسی غیر مرئی قوت سے زندہ ہے آپ مانیں یا نہ مانیں۔ اسی بیگم کی کی رُوح ان خطوں کو حاصل کرنے کے واسطے مجھے تکلیف دیا کرتی ہے ———

——— وسیم لاجواب ہو کر خاموش ہو گیا۔ کیونکہ سرے ہی سے یہ معاملہ اتنا مجبر العقول تھا۔ کہ اس پر بحث کرنا سوائے اپنا دماغ خالی کرنے کے کچھ معنی نہ رکھتا تھا۔ تاہم ہماری تشویش بڑھتی گئی اور ہم اس شش و پنج میں گھر چلے آئے ——— دن گذرتے گئے۔ صفدر کو اس سائے کی تکلیف بدستور تھی۔ اور اب اس کی افسردگی حد سے بڑھ چکی تھی۔ ایک دن دیوان صاحب صفدر کو دیکھنے آئے وہ بہت خوش تھے۔ جب سے وہ خط اُن کے گھر سے نکلے۔ پھر کبھی انہیں اس سایہ نے نہ ستایا تھا ——— وہ دیر تک صفدر سے باتیں کرتے رہے۔ صفدر اُن سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر میرے ڈر سے نہ کہہ سکتا تھا۔ وہ اکثر میرے سامنے ایسے خیالات کا اظہار کرتا رہتا جس

سے ہیں اُسے فاتر العقل سمجھتا اور اُسے کہنے سے روک دیتا۔ اس لئے وہ میرے سامنے اُن کو نہ دہرا سکتا تھا۔ لیکن آج مجھے بھی استفسار پر مائل دیکھ کر وہ بڑے سُست انداز سے کہنے لگا۔ "نہ جانے کب اور کہاں میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ پہلے تو مجھے اس کا کچھ زیادہ خیال نہ تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ میں یہ محسوس کرنے لگا ہوں کہ وہ خواب نہیں بلکہ حقیقت تھی۔ میں نے یہ وہم دُور کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ بجائے دور ہونے کے زیادہ مضبوط ہو رہا ہے اب وہ وہم ترقی پر ہے۔ مجھے خوف ہے کہ میں کہیں دیوانہ نہ ہو جاؤں ——"

—— وہ پھر کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔ کامل سکوت کے بعد اُس نے کہا۔ خواب میں میں نے دیکھا۔ کہ میں ایک لطیف سی چیز ہوں اور ایک تنگ و تاریک مثمن کمرے میں موجود ہوں جس کے درمیان ایک حوض میں الاؤ جل رہا تھا اور آگ کے بڑے بڑے انگارے دہک رہے تھے ——

—— آگ کے قریب ایک عورت کھڑی تھی اور اس کے سامنے ایک لمبی لمبی آنکھوں والا خوش رُو جوان پژمردہ صورت بنائے کھڑا تھا۔ عورت کہہ رہی تھی کہ اگر اُن کی سازش کامیاب ہو گی تو اُسے بہت جلد رہائی مل جائے گی۔ مرد کہنے لگا۔ پربھا اور نگ زیب کوئی معمولی انسان نہیں اس کے سامنے سازشوں کی کچھ حقیقت نہیں —— پربھا اور اورنگ زیب کے نام پر ہمارے کان کھڑے ہو گے۔ (دیوان صاحب نے مجھے معنی خیز نگا ہوں

سے دیکھا۔) وہ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا" خوش رد آدمی نے کہا اس معاملہ میں تم بالکل حصّہ نہ لو۔ کہیں تم پر کوئی مصیبت نازل نہ ہو جائے میری رہائی کی کوئی امید نہیں۔ اب میرے دل میں صرف ایک حسرت ہے کہ مرنے کے بعد میرا لاشہ اس زنداں کے گرد و نواح میں نہ رہے۔ بلکہ میرے خاندان کے افراد کے پہلو بہ پہلو دفن ہو —— یہ دل شکن باتیں سن کر وہ عورت رونے لگی۔ مرد نے پھر کہا" پر بھا رو دھو کر مجھے بزدل نہ بناؤ بلکہ میری ہمت بندھاؤ۔ اور اگر ہو سکے تو اپنی راجپوتی شان کے مطابق وعدہ کرو۔ کہ میری آخری آرزو پوری کرنے کی کوشش کرو گی ——

یہ سنتے ہی عورت فوراً آنسو پونچھ کر تن کر کھڑی ہو گئی اس نے سنجیدگی سے اس جلتی ہوئی آگ کی طرف اشارہ کر کے جواب دیا کہ بحیثیت ایک راجپوت عورت کے اس مقدس اگنی کنڈ پر حلف اٹھا کر کہتی ہوں۔ کہ اگر خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو میں آپ کو ضرور کسی شاہی قبرستان میں پہنچا کر چین لوں گی۔ اگر میں مر گئی تو یہ بچہ جو اس وقت میرے پیٹ میں ہے میری قسم کو پوری کرے گا۔

جس وقت وہ عورت قسم کھا رہی تھی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جو الفاظ وہ کہہ رہی ہے۔ وہی حرف بحرف میں دہرا رہا ہوں۔ یا دوسرے لفظوں میں میں نے بھی وہی قسم اٹھائی۔ اس کے بعد کا حال مجھے کچھ معلوم نہیں۔ البتہ اب روز بروز

میری بیقراری بڑھ رہی ہے اور میں ہر وقت انہی خیالات میں غرق رہتا ہوں"۔

دوسرے دن دیوان صاحب نے مجھے اور وسیم کو بلا بھیجا۔ اور کہنے لگے۔ میں وثوق سے کہتا ہوں کہ صفدر وہی پراسرار بچہ ہے جس کا ذکر شہزادہ مراد کی بیگم نے اس خط میں کیا تھا۔ اور اس لڑکے کی باتوں سے صاف ظاہر ہے۔ کہ اس کی روح بیدار ہے۔ اور کسی پراسرار دنیا میں اس قسم کی ادائیگی کا اقرار کر چکی ہے وسیم کہنے لگا۔ اتنی صدیوں کے بعد ایک گمنام لاش کی جستجو کتنی مضحکہ خیز بات ہے۔ دیوان صاحب بولے ہمیں قسم کی ادائیگی یا لاش سے کیا غرض۔ لڑکے کو صرف اس خیال سے وہاں لیجانا چاہیئے۔ کہ شاید اس سرزمین پر اس کے قدم پڑنے سے ایک بیچین رُوح کی تسکین ہو جائے اور وہ اسے ستانا چھوڑ دے ——————

ان پے در پے انکشافات نے ہمیں چکر میں ڈال رکھا تھا۔ اس لئے دیوان صاحب کے کہنے پر ہم صفدر کو سیر کے بہانے گوالیار لے گئے۔

(۴)

گوالیار پہنچکر دوسرے دن ہی ہم قلعہ دیکھنے گئے۔ زمانہ قدیم کی صنعت و عجائبات دیکھتے ہوئے اس عظیم الشان دمدمے پر چڑھ گئے۔ جہاں شاہی محلات تھے —————— وہاں ایک مضبوط جسم کا بوڑھا جاٹ چوکیدار ہمیں ملا۔ جو سر پر گاڑھے کا بڑا سا منڈاسا باندھے کھڑا تھا۔ اس کی کھچڑی داڑھی چڑھی ہوئی تھی۔ اور گھنے ابروؤں کے نیچے گول گول چمکتی ہوئی

آنکھوں سے سخت گہری جھلک رہی تھی ـــــــــــ یہ شخص بالکل گنوار تھا۔ اس نے ایک خاص انداز سے تن کر ہمیں سلام کیا۔ پھر ہاتھ سے ہمیں پیچھے آنے کا اشارہ کر کے آگے ہو لیا۔ وہ کئی ایک زینے اور بھول بھلیاں طے کرتا ہوا ہمیں ایک وسیع صحن میں لے گیا۔ جس کے اردگرد بڑے بڑے فراخ دالان موٹی تما ستونوں پر کھڑے تھے ـــــــــــ ویران محل کے اداس در و دیوار چرخ ناہنجار کی ہلاکت آفرینیوں کا گلہ زبان حال سے کہہ رہے تھے۔ بوڑھے چوکیدار نے اپنی پھٹی ہوئی جیب سے ایک زرد رنگ کا بوسیدہ کاغذ نکالا اور اُسے دیکھ کر کہنے لگا۔ یہ وہ جگہ ہے۔ جہاں اورنگ زیب نے بیچین راجے ایک مدت دراز تک مقید رکھے۔ آخر کار سری گوبندجی مہاراج نے انہیں رہائی دلائی ـــــــــــ اس کے بعد وہ واپس لوٹا اور اس شان تحکم سے ہمارے آگے چلنے لگا۔ گویا یہ عالیشان قلعہ اس کے باپ دادا کی ملکیت ہے وہ بے شمار زینے اترتا کئی تکونی ڈیوڑھیاں اور نیم چھت بخارچیاں عبور کرتا ہوا ہمیں ایک مثمن تہ خانے میں لے گیا۔ اس اندھیرے گپ میں ہم بہت گھبرائے۔ مگر بوڑھے چوکیدار نے جھٹ برقی لمپ روشن کر دیا۔ (مہاراجہ بہادر نے تمام قلعے میں روشنی کا مکمل انتظام کر رکھا ہے۔) ـــــــــــ برقی روشنی سے تہ خانہ کی تاریک و بدنما سنگی عمارت جگمگا اٹھی۔ اس تہ خانے کی درمیانی گنبد نما چھت سنگین ستونوں پر کھڑی تھی جن کی محرابوں کے دونوں طرف موٹے موٹے آہنی کڑے

لٹک رہے تھے اور ستونوں کے پیچھے چاروں طرف ایک ناریک روش بنی ہوئی تھی۔ زینے کی سنگین جالیوں سے آنے والی ہوا کے پریشان جھونکے تہ خانے کے قبر نما تنگ دروازے سے داخل ہو کر ایسی دردناک آواز پیدا کر رہے تھے جیسے کوئی بدقسمت اسیر سسکیاں لے لے کر رو رہا ہو ——

گنوار چوکیدار نے جھٹ زرد کاغذ جیب سے نکالا اور پڑھ کر کہنے لگا۔ اس تہ خانے میں مجرموں کو تہ تیغ کیا جاتا تھا۔ اور باغی ان آہنی کڑوں سے باندھ کر چوزنگ کئے جاتے تھے ہم چوکیدار کی باتیں سن رہے تھے۔ اور صفدر پاگلوں کی طرح چکر لگانے میں مصروف تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی چیز کی تلاش میں ہے ——

—— کچھ دیر بعد وہ خاموشی سے ستون کی ٹیک لیکر سوچنے لگا پھر چوکیدار سے کہنے لگا۔ تمہارا نام کیا ہے اور تم کب سے یہاں ملازم ہو بوڑھے نے جھٹ جیب سے زرد کاغذ نکال کر دیکھا اور جواب دیا۔ ہمارا نام دھرم دیو ولد شنکر دیو ولد گوپال دیو ولد سرجن دیو ولد دھن دیو ولد ہری نانھ دیو ہے ہم پشت ہا پشت سے اس قلعہ کے محافظ ہیں۔ بوڑھے کی زبانی ایک ہی سانس میں دیوتاؤں کا شجرۂ نسب سن کر ہمیں بے اختیار ہنسی آگئی۔ صفدر بھی مسکرا دیا

—— اس پر بوڑھا چوکیدار فخر سے اکڑتا ہوا تہ خانے سے نکلا اور پھر اس سے بھی نیچے جانے کے لئے زینے سے اترنے لگا۔ یہ زینے بہت ہی تنگ و تاریک تھے۔ مگر چوکیدار بجلی کے قمقمے روشن کرتا گیا۔ اس لئے کوئی خاص

وقت نہ ہوئی۔ اِن زمین دوز زمینوں کے اختتام پر تحت الثریٰ میں ایک اور مثمن تہ خانہ تھا جس کی ہوا نہایت کثیف اور نم آلود تھی ——

یہ کمرہ بلاشبہ ظلمات کا نمونہ تھا۔ گو بجلی روشن تھی۔ مگر اندھیرا پوری طرح دور نہ ہوا تھا۔ ستونوں سے باہر والی روش کی دیواریں سیاہی مائل دھندلی سی دکھائی دیتی تھیں ہم آگے تھے اور صفدر کسی گہری سوچ میں پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔

—— یہ تہ خانہ بھی ہوبہو اوپر والے تہ خانے کا نقشہ تھا۔ وہی ستونوں پر جھکی ہوئی گنبد نما چھت، وہی محرابوں میں لٹکتے ہوئے آہنی کڑے اسی طرح کی روش، البتہ یہاں ایک چیز کا اضافہ تھا۔ تہ خانے کے عین درمیان کوئی چار پانچ فٹ گہرا حوض بنا ہوا تھا ——

چوکیدار زرد کاغذ دیکھ کر کہنے لگا۔" صاحبان یہ وہ تہ خانہ ہے۔ جہاں اورنگ زیب بادشاہ نے اپنے بھائی شہزادہ مراد کو قید رکھا تھا۔ اس حوض کو اگنی کنڈ کہتے ہیں" جونہی بوڑھے کی زبان سے یہ الفاظ نکلے صفدر ہمیں دھکیلتا ہوا آگے بڑھا اور ایک دلخراش چیخ مار کر اس حوض میں کود پڑا۔ اور سسکیاں بھرتے ہوئے کہنے لگا آہ یہ وہی جگہ اور یہی اگنی کنڈ ہے۔ جہاں خواب میں میں نے ایک عورت کو قسم اٹھاتے دیکھا تھا۔ بہت دیر تک وہ اس تہ خانے میں دیوانہ وار پھرتا رہا آخر کار بڑی مشکل سے اسے سمجھا بجھا کر ہم ڈیرے پر واپس لائے۔

گوالیار آئے ہمیں تین دن گذر چکے تھے۔ ہفتے کی رات تھی۔ یکا یک

کریم نے ہمیں جگا کر اطلاع دی کہ صفدر غائب ہے۔ اس خبر سے ہمیں سخت تشویش ہو گئی۔ ہمیں خطرہ تھا۔ کہ وہ کسی نئی مصیبت کا شکار نہ ہو جائے۔ ہمیں یقین تھا کہ وہ ضرور قلعے کی طرف گیا ہو گا۔ چنانچہ ہم لوگ اسی وقت تیز رفتاری سے اُس کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔ گوالیار گیٹ کے قریب ہمیں ایک سایہ سا دکھائی دیا یہ صفدر تھا جو اندھا دھند قلعے کے صدر دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ وسیم کی رائے تھی کہ اس کے کسی کام میں دخل نہ دیا جائے۔ اور چپ چاپ اُسی کا تعاقب کر کے دیکھیں کہ وہ کیا کرتا ہے۔ دروازے کے قریب پہنچکر ہمیں انتہائی تعجب ہوُا۔ کیونکہ قلعے کے صدر دروازے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ صفدر اُس کھڑکی کی راہ سے اندر داخل ہو گیا۔ ہم بھی دبے پاؤں دروازے کے قریب گئے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو ایک عجیب نظارہ دکھائی دیا۔ بوڑھا چوکیدار ہاتھ میں زرد کاغذ پکڑے دیوار کی طرف منہ کئے کھڑا تھا۔ دیوار پر اس کے دو سائے پڑ رہے تھے وہ دیوانوں کی طرح ان سایوں سے باتیں کر رہا تھا ——

—— چاند اس وقت پوری تابانی سے روشنی کے فوارے اچھال رہا تھا اور سامنے فلک شکوہ پہاڑ قلعہ گوالیار کو اپنی ہتھیلی پر رکھے نیر لگئے دہر پر مبہوت کھڑا تھا۔ اس پہاڑی قلعہ پر چڑھتی ہوئی اُونچی اور پیچدار سڑک شفاف کرنوں کی نورانی چادر میں ڈھکی ہوئی تھی۔ صفدر سڑک پر دیوانہ وار دوڑتا ہوُا جا رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل میں آرزوؤں کا خوفناک شعلہ بھڑک رہا

ہے ——— رات کے بھیانک سکوت میں وہ خوفناک کھڈوں اور تاریک کھائیوں کی طرف جھک کر پربھا کو پکارنا، مدہوشی میں کھوئے ہوئے خوابیدہ درختوں سے پربھا کا پتہ پوچھنا فیل نما سرکش چٹانوں سے اس کا حال دریافت کرتا۔ مگر اس کی آواز سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا کر ہوا میں تحلیل ہو جاتی۔ وہ کھڈوں اور کھائیوں سے صدائے بازگشت کے سوا کوئی جواب نہ پاتا۔ وہ بے تابانہ بڑھتا جا رہا تھا۔ دو رویہ چٹانوں کی بلند فصیلوں کے درمیان پہنچکر وہ مہاتما جین کی طویل القامت مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا ——— یکایک ایک بگولہ اٹھا۔ جو کالی گھاٹیوں مہیب دراڑوں اور ویران کھنڈروں سے دردناک آواز پیدا کرتا ہوا چٹانوں سے ٹکرانے لگا یکایک ایسا معلوم ہوا کہ جین کی عظیم الہیت مورتی جس کے پاؤں تحت الثریٰ میں اور سر آسمان سے چھو رہا تھا۔ کانپ رہی ہے۔ اس کی گیان دھیان میں مگن اور آسمانی اسرار سے واقف آنکھیں اس پر گڑی ہیں۔ اس کے مقدس لبوں کو جنبش ہو رہی ہے عین اسی وقت ایک تاریک ابر نے چاند کے منہ پر نقاب ڈال دی ——— صفدر پھر آگے بڑھا۔ اب اس کی حالت سکون پذیر تھی اور وہ ہماری موجودگی سے آگاہ ہو چکا تھا دمدمے کے نشیب پر چڑھ کر اب وہ محلات کیطرف بڑھا۔ محلات تک پہنچکر وہ زمین دوز تہ خانے میں اتر گیا۔ ہم اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ اس کے تہ

خانے میں داخل ہوتے ہی وہی پُر اسرار سایہ سامنے کی دیوار پر نمودار ہو گیا مگر اب وہ صفدر کے سائے کے قریب نہ تھا۔ بلکہ ذرا فاصلے پر تھا سایہ اس انداز سے متحرک تھا جیسے صفدر کی کوششوں پر جوشِ مسرت سے کانپ رہا ہو ——— صفدر راگنی کنڈ کے قریب جا کر ہمیں مخاطب کر کے کہنے لگا۔ آج مجھے مہا تما جین نے عجیب راز بتایا ہے۔ میں آپ لوگوں کو اس مقدس اگنی کنڈ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ مجھے بتاؤ کہ میں کس کا بیٹا ہوں"؟ ——— سنسان رات کے وحشت خیز سناٹے اور خوفناک تہہ خانے کی پُر ہول فضا میں جبکہ کئی صدیوں کی ایک بےچین رُوح اپنا سیاہ فوٹو سامنے والے دھندلی دیوار پر کھینچ رہی تھی ہم اس واقعہ کو نہ چھپا سکے۔ اگر ہم غلط بیانی سے کام لیتے تو شاید یہ عکس ہم پر جھپٹ پڑتا۔ محرابوں میں سے ستونوں کے بھدے سائے کہنہ دیواروں پر اس طرح پڑنے لگے۔ جیسے آہنی کڑوں کے ساتھ انسانی دھڑ لٹک رہے ہوں ——— ہم نے کانپتے ہوئے اُس کے قبر سے برآمد ہونے کے علاوہ پرانی تحریروں کے متعلق بھی سب کچھ بتا دیا۔ جو وہ نہایت متانت سے سنتا رہا۔ جب ہم یہ ذکر کر چکے تو وہ چوکنا ہو کر کہنے لگا "آپ نے بھی کچھ سنا؟" ہم نے تو نفی میں جواب دیا۔ مگر کریم تھرتھراتے ہوئے بولا۔ ہاں میں نے سُنا ہے۔ ابھی یہ بات اُس کے منہ میں ہی تھی کہ یکایک ایک دل ہلا دینے

والی ڈرائونی آواز سنائی دی۔ہمارے دِل دھک دھک کرنے لگے ــــــ

ــــــ اُف! پناہ بخدا! یہ آواز ہڈیوں کی کھڑکھڑاہٹ تھی جو ایک تاریک کونے سے سنائی دے رہی تھی۔میری روح کھنچکر آنکھوں میں آگئی۔میں ٹکٹکی باندھ کر اس کونے کی طرف دیکھنے لگا۔میرا خیال تھا۔کہ ابھی ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ ہمارے سامنے آکھڑا ہوگا۔مگر خدا کا شکر ہے کہ ایسا نہ ہُوا۔البتہ وہ دلخراش کھڑکھڑاہٹ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد بدستور ہوتی رہی ــــــ صفدر بالکل بے خوف وہراس اس دیوار سے کان لگا کر اس آواز کو سن رہا تھا۔آخر کار اس نے کہا۔ضرور اس جگہ کہیں میرے باپ کی ہڈیاں مدفون ہیں ــــــ

ــــــ دیوار کے پیچھے ٹھوس پہاڑ تھا۔اس نے دریچہ نما ڈیوڑھی کی طرف جو دیوار کا تھوڑا سا حصّہ خالی تھا۔جا کر دیکھنا شروع کیا اسجگہ برقی روشنی صاف طور پر نہ پڑتی تھی۔اس لئے بہت دِقت پیش آئی آخر بڑی مشکل سے اُسے دیوار میں ایک چھوٹے سے دروازے کی ڈاٹ نظر آئی جو بعد میں پتھروں سے چن دی گئی تھی۔اس ڈاٹ کا درمیانی حِصّہ بجا کر دیکھنے سے کھوکھلا معلوم ہوتا تھا ــــــ صفدر نے کریم سے اس کا شکاری چاقو لے کر پتھریلی دیوار کھودنا شروع کی اور گھنٹہ بھر کی لگاتار کوشش سے ایک پتھریلی اینٹ نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔اس کے بعد وہ اس سوراخ

میں ہاتھ ڈال کر اینٹوں کو زور زور سے اکھاڑنے لگا۔ اس کا خیال صحیح نکلا۔ یہاں کسی زمانے میں ایک الماری بنی ہوئی تھی جس کا دروازہ ڈیوڑھی میں تھا۔ جب دیوار میں کافی شگاف ہو گیا تو ہم بھی اس کام میں اس کا ہاتھ بٹانے لگے اور مسلسل محنت کے بعد ہم نے وہ چنی ہوئی ڈاٹ پوری کھول کے رکھدی ــــــــــــــ یہ ایک الماری کا خانہ تھا جس میں انسانی ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ تھا۔ صفدر اس ڈھانچے کے قریب دوزانو بیٹھ کر دعا کرنے لگا۔ ہم بھی اس کے ساتھ دعا میں شامل تھے۔ گویا یہ ایک بدنصیب تاجدار کی نماز جنازہ تھی جو تین صدیوں کے بعد چار آدمیوں نے تنہائی کی گھڑیوں میں نہایت بے سروسامانی سے ادا کی۔ دُعا کے بعد وہ ہڈیوں کو بوسہ دے کر اٹھا اور گلوگیر آواز میں کہنے لگا۔ اب ان مقدس ہڈیوں کو یہاں سے کس طرح لیجائیں۔ کریم نے اپنا کمبل زمین پر پھیلا دیا۔ جس میں سب ہڈیاں اکٹھی کر کے باندھ لی گئیں۔ ہم تہ خانہ سے نکل کر بصد عجلت تمام پہاڑی راستہ عبور کر کے نیچے صدر دروازہ کے قریب پہنچے۔ بوڑھا چوکیدار ابھی تک اسی طرح سایوں سے باتیں کر رہا تھا۔ ہم چپ چاپ باہر نکل آئے۔

(۵)

اس واقعہ کے بعد دوسرے دن ہم پھر ایک دفعہ سکندرہ آئے۔ کیونکہ اسی فقیر کی مدد سے ان ہڈیوں کو وہاں ٹھکانے لگانا آسان تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہؤا۔ رات کے وقت جبکہ آسمان تاریک بادلوں سے گھرا ہؤا تھا۔ ہوا کسی

نا شاد کی شومیٔ بخت پر ٹھنڈی سانس بھر رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صدیوں سے محوِ آرام شاہی خاندان کی روحیں اپنے ایک فرد کی آمد کے انتظار میں چشم شوق وا کیے پرانی قبروں سے جھانک رہی ہیں ہم ان ہڈیوں کو کفن میں باندھکر وہاں لے گئے بوڑھا فقیر اور کریم ہمارا انتظار کر رہے تھے انہوں نے قبرستان میں گڑھا کھود رکھا تھا۔ جہاں اس گمنام تاجدار کی پامال شدہ ہڈیوں کو دبا دیا گیا۔ عین اسی وقت کہیں دور خانہ بدوشوں کی جھونپڑی سے کسی نے نہایت سوز و گداز سے گایا ؎

دیکھے ہیں اُجڑتے ہوئے خوشحال کئی
دنیا سے مٹے صاحب اقبال کئی
آہستہ چل آہستہ کہ مٹی کے تلے
خوابیدہ ہیں معشوق جواں سال کئی

اور ساتھ ہی نازک و نفیس ہستیوں کے خوشبودار خمیر میں گندھا ہوا ہوا کا ایک جھونکا آ کر زمین پر سر دھننے لگا۔ ہمیں محسوس ہوا کہ سینکڑوں گلبدن روحیں اپنے بچھڑے ہوئے عزیز کی بوسیدہ ہڈیوں سے لپٹ لپٹ کر نثار ہو رہی ہیں ——— صفدر نے اپنی ماں کی شکستہ قبر بھی دیکھی اس کی حالت دیکھ کر وہ بہت آزردہ ہوا۔ میں نے فوراً اس کی مرمت کا انتظام کر دیا۔ دوسرے دن شام تک مرمت ہو گئی۔ شام کے قریب ہم اُسے واپس لائے تو وہ بالکل

پاگل ہو چکا تھا ——— اسے بڑی مشکل سے سلا دیا گیا۔ مگر آدھی رات کو میری آنکھ کھلی تو صفدر بستر پر موجود نہ تھا۔ میں نے بدحواسی سے وسیم اور کریم کو جگایا اور اس کی تلاش شروع کی ——— رات سخت اندھیری تھی۔ ہاتھ پسارے کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ جھکڑ کے تھپیڑے ہمیں دھکیل دھکیل کر پیچھے ہٹا رہے تھے۔ آندھی کا غبار ہمارا راستہ روکنے کے درپے تھا۔ اور درخت غیظ و غضب سے دوہرے ہو ہو کر ہمیں پکڑنے کو دوڑ رہے تھے۔ ہم اس کی تلاش میں قبرستان کی طرف روانہ تھے۔ ——— صبح تک ہم سرگرداں رہے۔ صبح کے وقت ایک جھاڑی کے قریب ہمیں صفدر کے پاؤں کا ایک بوٹ پڑا ملا۔ بوٹ کو دیکھ ہمیں کچھ تسلی ہو گئی۔ کریم کہنے لگا وہ کہیں قرب و جوار میں ہی ہو گا۔ اور ضرور اپنی ماں کی قبر پر آئے گا۔ یہاں اس کا انتظار کرنا چاہیئے۔ ———

——— اس کی ماں کی قبر کو دیکھ کر ہمیں بہت حیرت ہوئی۔ اس نئی بنی ہوئی قبر کے عین درمیان ایک لمبی لکیر نمودار ہو رہی تھی۔ گویا معلوم ہوتا تھا۔ کہ قبر شق ہو کر دوبارہ ملی ہے۔ میں گہری سوچ میں پڑ گیا۔ یکایک میری نظر ایک عجیب چیز پر پڑی۔ انتہائی رنج و غم سے میری چیخیں نکل گئیں۔ آہ سرہانے کے قریب قبر کی لکیر نما دراز سے صفدر کے کوٹ کا کونہ باہر لٹک رہا تھا۔

داغ معصیت

لاہور

۵ ستمبر ۱۹۳۸ء

اکتوبر کے آخری دن تھے۔ کائناتِ رنگ و بو پر بے رحم خزاں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ سبزہ پائمال۔ درخت خاک آلود اور ہوائیں اندوہگیں ہوتی جا رہی تھیں۔ شری پنڈت امرت بابو جس نے قومی مفاد کے لئے اپنی زندگی ہندو گرل کالج کی پروفیسری کے لئے وقف کر دی تھی۔ موسم کے تاثرات سے کھویا کھویا کالج کے احاطہ میں داخل ہوا۔

ابھی بہت سویرا تھا۔ سوائے خاکروب کے جھاڑو کی آواز کے ہر طرف

خاموشی تھی۔ رات کو چاند نے گرہن کیا تھا۔ اس لئے خاکروب کو دیکھ کر امرت بابو نے بد دلی سے چاندی کا سکہ اُسکی طرف پھینکا۔ اور برآمدے کی طرف چل دیا۔ برآمدے میں پہنچکر جیسے ہی امرت بابو نے زینے پر قدم رکھا اس کی ایک حسین دوشیزہ پر نگاہ پڑی۔ جو زینے سے ٹیک لگا کر کھڑی تھی۔ خوف و ہراس سے اس کا رنگ اڑ گیا۔ وہ دھڑکتے ہوئے دِل سے آگے بڑھا۔ "تم کون ہو؟" اس نے اپنے دلی خوف کو دباتے ہوئے کہا۔ دوشیزہ ایک مرمری مجسمے کی طرح ساکت وصامت کھڑی تھی۔ اس کے خوشنما یاقوتی لبوں میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا اور اس نے آہستہ سے اپنا نام بتا دیا۔

نہ جانے اس کے نام میں کیا بھرا تھا کہ امرت بابو کو پسینہ آ گیا۔ مگر فوراً ہی اپنی حالت پر قابو پا کر وہ خونخوار نگاہوں سے لڑکی کو دیکھنے لگا۔ گویا وہ مجرم تھی ——— وہ لڑکی بھی بلا کی نڈر تھی۔ بجائے ڈرنے کے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر برابر اس پر گھورتی رہی۔ کئی منٹ تک دونوں کی یہی حالت رہی گویا وہ ایک دوسرے کو پہچان رہے تھے ——— آخر بحرِ حسن میں ایک ہلکی سی موج اٹھی۔ لڑکی کے صدف گوں لبوں سے دُرِ یتیم کی لڑیاں جھلکنے لگیں۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ یہ مسکراہٹ امرت بابو کی بوکھلاہٹ کے لئے کافی تھی۔ اور وہ بے اختیار "جودھا جودھا!" بڑبڑاتا ہوا جدھر سے آیا تھا واپس چلا گیا۔ لڑکی کی حسین آنکھیں دُور تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔

امرت بابو نے کالج سے دو دن کی رخصت لے لی۔ وہ وہاں جانا نہ چاہتا تھا۔ تیسرے دن وہ کالج کو روانہ ہوا۔ اتفاقاً وہ لڑکی راستے میں ہی کھڑی تھی۔ وہ اس کو دیکھ کر مسکرائی۔ امرت بابو لرز گیا۔ مگر بظاہر بے پروائی سے چھڑی گھماتا دفتر کی طرف چلا گیا۔

چونکہ امرت بابو اعزازی کام کرتا تھا۔ اس لئے کالج میں اس کی بہت عزت تھی۔ جب وہ دفتر میں داخل ہوا۔ تو مسٹر کیلاش جو کالج کا نوجوان اور قابل پرنسپل تھا، تعظیماً کھڑا ہو گیا۔ مگر امرت بابو بغیر کسی التفات کے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار تھے۔ کیلاش بےچینی سے اس کی گفتگو کا منتظر تھا آخر بڑی دیر کے بعد امرت بابو نے مُہر سکوت توڑی "مسٹر کیلاش کوئی نئی لڑکی بھی کالج میں داخل ہوئی ہے؟" اس نے دریافت کیا۔ "ایک نہیں چار" کیلاش نے جواب دیا۔ "ان میں کوئی جودھا بھی ہے؟" اس نے پوچھا۔ "جودھا؟ میرے خیال میں تو اس نام کی کوئی لڑکی داخل نہیں ہوئی۔" کیلاش نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ اور پھر رجسٹر کو دیکھ کر کہا۔ "جودھا، تو نہیں لنبو دھا ہوگی۔ آپ کو دھوکا ہوا۔" "اجی نہیں۔ اس کا نام جودھا ہے۔" امرت بابو نے کہا۔ "میں نے ابھی اُسے برآمدے میں دیکھا ہے اس کے متعلق آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں کیا؟" کیلاش نے دریافت کیا "ہاں"۔ امرت بابو نے کہا۔ "وہ نہایت گستاخ لڑکی ہے۔ مجھ پر آتے جاتے آوازے کستی ہے۔ ایسی لڑکیوں کے لئے ہمارے

کالج میں جگہ نہ ہونی چاہیئے۔" جودھا نام کی کوئی لڑکی کالج میں نہ تھی۔ کیلاش نے ناچار اسی یشودھا کو بلا بھیجا۔

حکم حاکم مرگ مفاجات یشودھا حاضر ہوئی۔ امرت بابو نے اُسے فوراً پہچان لیا۔" یہی جودھا ہے"۔ امرت بابو نے نفرت انگیز نگاہوں سے اُسے دیکھ کر کہا۔ لڑکی نے جو امرت بابو کی برہمی سے بے خبر تھی۔ تنک کر نہایت بھولے پن سے جواب دیا۔" جودھا نہیں بلکہ جودھا کی روح"۔ روح کے لفظ پر امرت بابو اچھل پڑا۔" خاموش لڑکی" ایک کرخت آواز سے اُس نے کہا اور کچلے ہوئے سانپ کی طرح غضب ناک نگاہوں سے لڑکی کو دیکھا۔ لڑکی سہم کر پیچھے ہٹی۔ کیلاش نے جو لڑکی کے سحر آفریں حسن کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ چونک کر کہا" دیوی تعلیم یافتہ لڑکیاں ایسی فضول باتیں نہیں کرتیں"۔" میں نے تو کچھ نہیں کہا"۔ لڑکی نے روندھے ہوئے گلے سے جواب دیا۔" تمہاری سراسر غلطی ہے"۔ کیلاش نے کہا" ابھی بابو جی نے تمہارا نام پوچھا۔ تم نے الٹا پلٹا جواب دیا"۔ بابو جی نے میرا نام نہیں پوچھا۔ جودھا کہکر خطاب کیا ہے۔ حالانکہ میرا نام یشودھا ہے"۔ کیلاش نے دل کڑا کر کے کہا۔" جودھا ہو یا یشودھا اس میں بگڑنے کی کون سی بات ہے اتنی زود رنجی اور تنک مزاجی اچھی نہیں ہوتی۔ وہ تمہارے استاد ہیں استاد اور پتا کا درجہ ایک ہوتا ہے"۔ کیلاش نے ناصحانہ انداز میں کہا۔ پتا کا لفظ سنتے ہی یشودھا کا چہرہ اتر گیا۔ اس نے دبی زبان سے دو تین بار پتا کا لفظ دہرایا۔

پھر امرت بابو کے پاؤں پر گر پڑی۔

حسن و معصومیت کے اس بہترین دلکش اور قدرتی نظارے نے کیلاش کے جذبات میں ہلچل ڈال دی۔ وہ ایک ذمہ دار شخص تھا۔ لیکن بشودھا نے اپنے معصومانہ طرزِ عمل سے اس کی آرزوؤں کو بیدار کر دیا۔ بشودھا کی ایک ایک ادا اُس کے قلب کی گہرائیوں میں اتر گئی۔

(۲)

امرت بابو حساب کا پروفیسر تھا۔ اس کی کلاس کی لڑکیاں بے انتہا شریر تھیں۔ جنہوں نے اپنی شرارتوں سے اس کا ناک میں دم کر رکھا تھا امرت بابو اکثر ان کی شرارتوں کو نظر انداز کر دیتا۔ لیکن بشودھا سے جو نہایت ادب سے کلاس میں بیٹھتی اور صحیح معنوں میں اس کی عزت کرتی۔ امرت بابو برابر سختی کا برتاؤ کرتا رہا۔ ایک دن امرت بابو لیکچر دے رہا تھا۔ کہ یکایک ایک لڑکی بے اختیار ہنس پڑی اس کی دیکھا دیکھی دوسری لڑکیاں بھی ہنسنے لگیں۔ مگر بشودھا بالکل خاموش رہی کلاس میں یوں ہنسنا پروفیسر کی کھلی توہین تھی۔ وہ لڑکیوں پر برس پڑا۔

دُوسرے دن امرت بابو بشودھا سے کہنے لگا "میں تم سے بہت خوش ہوں۔ اب تم کسی حد تک سدھر گئی ہو۔ ورنہ کل لڑکیوں میں اگر تم بھی شامل ہوتیں تو شاید ــــــ بابو جی کو مہربان پا کر بشودھا کے چہرے پر رونق

آ گئی"۔ "شاید آپ کیا کرتے۔ بابوجی فقرہ تو پورا کیا ہوتا۔" بشودھا نے الھڑپن سے کہا۔ امرت بابو نے ہنس کر جواب دیا۔ "شاید میں تمہارا خون کر دیتا"۔ یکدم تمام لڑکیوں کا رنگ فق ہو گیا۔ "انسانی خون" انہوں نے کانپتے ہوئے کہا۔ بشودھا نے افسردگی سے سر جھکا لیا۔ امرت نے لڑکیوں نے مزید خوف دلانے کے لئے کہا۔ "ہاں انسانی خون" ——— بشودھا کو یہ بات سخت ناگوار گزری۔ "انسانی خون بہانا آپ سے کیا بعید ہے۔ آپ آگے بھی اس کی مشق کر چکے ہوں گے۔" اس نے رنج سے کہا۔ بشودھا کے جواب سے اسکے دل پر برچھی سی لگی۔ غیظ و غضب سے اس کی پیشانی کی رگیں اُبھر آئیں تاہم وہ غصّہ کو پی گیا۔ اب وہ اس کے خون کا سچ مچ پیاسا ہو گیا۔ ہر وقت وہ چاہتا تھا۔ کہ کسی طرح بشودھا کو ذلیل کر کے کالج سے نکال دیا جائے......

بیساکھ کی ایک رومان پرور رات تھی، چاندنی صحنِ چمن کی بلائیں لے رہی تھی۔ دھرتی ماتا اپنے پرانے پر پرزے جھاڑ کر نئی نویلی دلہن دکھائی دیتی تھی۔ ہر پھول پتی پر جوانی کا عالم تھا۔ امرت بابو اپنے باغ میں شہتوت کے درخت کے نیچے بنچ پر بیٹھا کسی شخص سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہا تھا اُس کی گھبرائی ہوئی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی بڑی راز کی بات ہے ——— کچھ دیر کے بعد جب اس کا ساتھی باہر نکلا۔ تو سنگترے کی باڑ کے پیچھے کسی کو چھپا ہوا پایا۔ اس نے گھبرا کر امرت بابو کو آواز دی

امرت بابو دوڑا دوڑا باہر آیا ـــــــ چمکتی ہوئی چاندنی میں اس نے ایک نازک اندام لڑکی کو دیکھا۔ جو سڑک کو عبور کر کے سامنے والی کوٹھی کے پھاٹک تک پہنچ چکی تھی۔ امرت بابو کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ سامنے والی کوٹھی دراصل ہندو گرلز کالج کا ہوسٹل تھا۔ "یہ یقیناً بسنودھا تھی" امرت بابو نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ اور پیچ و تاب کھاتا ہوا واپس آ گیا۔ "آہ! میرا راز اب ایک ایسی لڑکی کے ہاتھ میں ہے۔ جو میری سخت ترین دشمن ہے"۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ وہ سخت ہراساں تھا۔ آہ! موت ایک خوفناک چیز تھی۔ ورنہ وہ موت کو رسوائی پر ترجیح دیتا۔ یکایک ایک خطرناک خیال اس کے ذہن میں آیا۔ بسنودھا کے سوا سب لڑکیاں موسمِ بہار کی چھٹیوں پر جا چکی تھیں۔ ہوسٹل میں اس کے سوا صرف ایک آیا موجود تھی۔ اس نے ایک رومال پر کلوروفارم انڈیلا۔ جو ایک دن پہلے وہ دانت کے درد کے لئے لایا تھا۔ اسے چرمی بٹوے میں ڈالا۔ اور ہوسٹل کی دیوار پھاند کر اندر جا داخل ہوا۔

بارہ بجے کا عمل تھا۔ ہوسٹل پر تقدس بار سکوت طاری تھا۔ بسنودھا کے کمرے میں روشنی نظر آ رہی تھی ـــــــ ہوسٹل کے پچھواڑے باورچی خانہ تھا۔ جس کے گودام کی کوٹھڑی ان کمروں سے ملحق تھی۔ امرت بابو نے کمزور تالے کو ایک جھٹکے سے توڑ دیا۔ اور گودام کے ذریعے کئی کمروں سے

گزرتا ہوا یشو دھا کی خواب گاہ میں ایک بھاری پردے کے نیچے چھپ گیا۔

چونکہ سب کمرے خالی تھے۔ اس لئے یشو دھا دوسرے کمرے میں آیا کے پاس بیٹھی کچھ سی رہی تھی۔ کیونکہ صبح اس کو اپنے گھر جانا تھا۔ کچھ دیر بعد آیا سو گئی اور یشو دھا اپنی خواب گاہ میں جا پہنچی۔

یشو دھا اس وقت سچ مچ حسن کی دیوی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پھولوں کے دو خوبصورت ہار تھے۔ اس نے اندر سے دروازے کی چٹخنی لگائی اور سامنے کی دیوار سے لگے ہوئے میز کی طرف بڑھی۔ اب وہ امرت بابو کے بالکل قریب تھی۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی آئینہ نما تصویر سے کپڑا اٹھایا اور ہار اس کے فریم پر ڈال کر پوجا کے طریقے پر سرنگوں ہو گئی —— فرطِ حیرت سے امرت بابو کی آنکھیں پتھرا کر رہ گئیں اس کے اعضاء ڈھیلے پڑ گئے۔ میز پر رکھی ہوئی تصویر خود امرت بابو کی تصویر تھی۔ پوجا کے بعد اُس نے تصویر کو مخاطب کر کے کہا مہاراج آج تک کسی کے دل میں آپ کی اتنی محبّت نہ ہو گی۔ جتنی دکھیا یشو دھا کے دل میں موجود ہے"۔ پھر وہ دیر تک تصویر کو دیکھ کر روتی رہی۔ بعد ازاں تصویر کو بدستور کپڑے سے ڈھانپ دیا اور اپنے بستر پر چلی گئی —— امرت بابو نے اپنا خوفناک ارادہ ترک کر دیا۔ اور جس طرح وہاں پہنچا تھا۔ اسی طرح چپ چاپ چلا آیا۔

اس کا دماغ نئے نئے خیالات کی آماجگاہ بنا ہُوا تھا۔ وہ خوبصورت تھا۔ وجیہہ تھا۔ تاہم اسکی عمر چالیس کے قریب تھی۔ اس عمر میں وہ روپیہ کے زور سے کسی عورت کو اپنا بنا سکتا تھا۔ لیکن کوئی لڑکی اس پر عاشق نہ ہو سکتی تھی۔ پھر بشنو دھا جیسی نوخیز لڑکی ——————— وہ تمام رات اسی ادھیڑ بن میں رہا۔ وہ اب بھی اس سے نفرت کرتا تھا۔ تاہم اس کی کدورت کسی حد تک ڈھل گئی۔ اس نے فیصلہ کر لیا۔ کہ آئندہ وہ بشنو دھا سے نرمی کا برتاؤ کرے گا۔

(۳)

سردی کے دن تھے۔ رات کو چاند گرہن تھا۔ ہندو بھائیوں نے گرہن کا وقت نہروں، تالابوں یا دریاؤں کے کناروں پر کاٹا۔ لوگوں کا خیال تھا۔ کہ اس سال کا چاند گرہن نسبتاً زیادہ دیر رہا۔ دوسرے دن کو کالج میں چھٹی تھی۔ مگر لڑکیوں کو ہوسٹل میں کسی سے معلوم ہُوا کہ امرت بابو علیل ہیں وہ پرنسپل کے ساتھ اُس کی عیادت کو گئیں۔

امرت بابو بظاہر بیمار نہ تھا۔ مگر کسی اندرونی تکلیف نے اُسے نڈھال کر رکھا تھا۔ لڑکیوں نے خیریت پوچھی تو امرت بابو نے بتایا۔ کہ ہمیشہ چاند گرہن کے موقع پر اس کی طبیعت خراب ہو جایا کرتی ہے بشنو دھا نے آہ بھر کر کہا۔

"ہاں جب دیوتاؤں کو پاپ کی سزا مل سکتی ہے۔ تو پھر انسان کی کیا حقیقت

گزرتا ہوا بشودھا کی خواب گاہ میں ایک بھاری پردے کے پیچھے چھپ گیا۔

چونکہ سب کمرے خالی تھے۔ اس لئے بشودھا دوسرے کمرے میں آیا کے پاس بیٹھی کچھ سی رہی تھی۔ کیونکہ صبح اس کو اپنے گھر جانا تھا۔ کچھ دیر بعد آیا سو گئی اور بشودھا اپنی خواب گاہ میں جا پہنچی۔

بشودھا اس وقت سچ مچ حسن کی دیوی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پھولوں کے دو خوبصورت ہار تھے۔ اس نے اندر سے دروازے کی چٹخنی لگائی اور سامنے کی دیوار سے لگے ہوئے میز کی طرف بڑھی۔ اب وہ امرت بابو کے بالکل قریب تھی۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی آئینہ نما تصویر سے کپڑا اٹھایا اور ہار اس کے فریم پر ڈال کر پوجا کے طریقے پر سرنگوں ہو گئی ——— فرط حیرت سے امرت بابو کی آنکھیں پتھرا کر رہ گئیں اس کے اعضاء ڈھیلے پڑ گئے۔ میز پر رکھی ہوئی تصویر خود امرت بابو کی تصویر تھی۔ پوجا کے بعد اُس نے تصویر کو مخاطب کر کے کہا مہاراج آج تک کسی کے دل میں آپ کی اُتنی محبّت نہ ہو گی۔ جتنی دکھیا بشودھا کے دل میں موجود ہے"۔ پھر وہ دیر تک تصویر کو دیکھ کر روتی رہی۔ بعد ازاں تصویر کو بدستور کپڑے سے ڈھانپ دیا اور اپنے بستر پر چلی گئی ——— امرت بابو نے اپنا خوفناک ارادہ ترک کر دیا۔ اور جس طرح وہاں پہنچا تھا۔ اسی طرح چپ چاپ چلا آیا۔

اس کا دماغ نئے نئے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ خوبصورت تھا۔ وجیہہ تھا۔ تاہم اسکی عمر چالیس کے قریب تھی۔ اس عمر میں وہ روپیہ کے زور سے کسی عورت کو اپنا بنا سکتا تھا۔ لیکن کوئی لڑکی اس پر عاشق نہ ہو سکتی تھی۔ پھر لیشو دھا جیسی نوخیز لڑکی —————— وہ تمام رات اسی ادھیڑ بن میں رہا۔ وہ اب بھی اس سے نفرت کرتا تھا۔ تاہم اس کی کدورت کسی حد تک ڈھل گئی۔ اس نے فیصلہ کر لیا۔ کہ آئندہ وہ لیشودھا سے نرمی کا برتاؤ کرے گا۔

(۳)

سردی کے دن تھے۔ رات کو چاند گرہن تھا۔ ہندو بھائیوں نے گرہن کا وقت نہروں، تالابوں یا دریاؤں کے کناروں پر کاٹا۔ لوگوں کا خیال تھا۔ کہ اس سال کا چاند گرہن نسبتاً زیادہ دیر رہا۔ دوسرے دن کالج میں چھٹی تھی۔ مگر لڑکیوں کو ہوسٹل میں کسی سے معلوم ہوا کہ امرت بابو علیل ہیں وہ پرنسپل کے ساتھ اُس کی عیادت کو گئیں۔

امرت بابو بظاہر بیمار نہ تھا۔ مگر کسی اندرونی تکلیف نے اُسے نڈھال کر رکھا تھا۔ لڑکیوں نے خیریت پوچھی تو امرت بابو نے بتایا۔ کہ ہمیشہ چاند گرہن کے موقع پر اس کی طبیعت خراب ہو جایا کرتی ہے لیشودھا نے آہ بھر کر کہا۔ "ہاں جب دیوتاؤں کو پاپ کی سزا مل سکتی ہے۔ تو پھر انسان کی کیا حقیقت

ہے۔ اُسے کیوں نہ اپنے پاپ یاد آئیں اور خاص کر اس وقت جبکہ وہ ——

—— " اس نے فقرہ نامکمل چھوڑ دیا۔ امرت بابو نے کرب

اور بیچینی نے آنکھیں بند کرلیں اور تھکی ہوئی آواز میں اس کا فقرہ یوں پورا کر

لیا " جبکہ وہ بوڑھا ہو چکا ہو اور موت کے قریب پہنچ رہا ہو " ——

لڑکیاں سہم کر چپ ہو گئیں کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ کیلاش نے دیکھا۔

تو وہ سو رہا تھا۔ اس لئے جلدی لڑکیوں کو واپس لے آیا۔

اس واقعہ کو بہت دن گذر چکے تھے۔ خزاں کا بدشگون موسم تھا۔ ہوا موت کے پروں پر اڑ رہی تھی۔ رات بھر طوفان برپا رہا۔ صبح امرت بابو کلاس میں لیکچر دے رہا تھا کہ یکایک آسمان پر پھر وہی سُرخ آندھی اُٹھی۔ بشو دھا نے جو کھڑکی کے قریب بیٹھی تھی۔ دوسری لڑکی کو کچھ اشارہ کیا۔ امرت بابو جو اس وقت اتفاقاً بشو دھا کی طرف دیکھ رہا تھا خفا ہو کر بولا ——

—— بشو دھا کام کی طرف دھیان کرو۔ باتیں پھر کرنا۔" میں نے تو اُسے صرف آندھی دکھائی ہے بابو جی " بشو دھا نے جواب دیا۔ " کیسی آندھی " امرت بابو نے جھلا کر کہا " سُرخ آندھی "۔ بشو دھا نے دوبارہ کہا —— ایک لڑکی بولی " کیا تم آندھی سے ڈرتی ہو " بشو دھا نے لرز کر کہا " ہاں لوگ کہتے ہیں جب مظلوم روحیں اپنے انتقام کے لئے بے قرار ہو کر ہوا میں منڈلاتی ہیں تو اُن کے خون کی سُرخی سے ہوا سُرخ آندھی کی

صورت اختیار کر لیتی ہے۔" لڑکی نے کہا۔ کیا تم نے بھی کوئی خون کیا ہے۔ جو ڈرتی ہو یا کوئی اور قاتل یہاں بیٹھا ہے۔ جس کے پاپوں کی نحوست کا تمہیں ڈر ہے۔" لبشو دھا نے پیچھا چھڑاتے ہوئے کہا۔" میں نے تو کسی کو قتل نہیں کیا۔ اور نہ کسی دوسرے کے متعلق کچھ جانتی ہوں۔ یہ تو ایک پاپی کا دل ہی جان سکتا ہے" ——— لڑکیاں اس کی بے وقوفی پر ہنسنے لگیں۔

بات گئی گزری ہو گئی مگر اس دن سے امرت بابو کی طبیعت زیادہ خراب ہوتی گئی۔ اکثر اس کی نگاہوں سے خوف و ہراس کا سراغ ملتا تھا اب وہ اپنی عمر سے دس سال زیادہ بوڑھا دکھائی دینے لگا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں گنٹھیے کا درد تھا۔ اس لئے وہ اسے گلے میں بندھے ہوئے ایک رومال میں لٹکائے رکھتا۔

وقت گزرتا گیا۔ کالج کا سالانہ جلسہ تھا۔ پارٹی کی تیاریاں ہو رہی تھیں ہر ایک لڑکی کو مختلف کام سپرد کیا گیا۔ امرت بابو منتظم کی حیثیت سے لڑکیوں کا کام دیکھتا ہوا ہال کی طرف آیا۔ لبشو دھا میز کو پھولوں سے سجا رہی تھی۔ امرت بابو کو دیکھ کر اس کے چہرے پر مسرت کی سرخی دوڑ گئی اور وہ اپنی گلابی انگلیوں سے جلدی جلدی کام لینے لگی۔" تم پھول گوندھنے میں ماہر ہو لبشو دھا" امرت بابو نے خوش ہو کر کہا۔ یکایک وہ کسی چیز سے خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹا۔

"کیوں بابوجی خیر تو ہے" لبشو دھا نے حیرت سے پوچھا۔ "تمہارے ہاتھ پر یہ داغ کیسا ہے؟" امرت بابو نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے سوال کیا۔ "چاند گرہن کا بابوجی" لبشو دھا نے جواب دیا ———

لبشو دھا کے بائیں ہاتھ پر پیسے کے برابر گول داغ تھا۔ جو آدھا سُرخ تھا اور آدھا سیاہ ——— "چاند گرہن کا داغ" امرت بابو نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا "ہاں چاند گرہن کا" لبشو دھا نے پھر جواب دیا۔ "کیا تمہارے اس داغ میں جلن بھی ہوتی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ایسے منحوس داغ چاند گرہن کے موقعہ پر جلا کرتے ہیں"۔ امرت بابو نے داغ کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ "نہیں بابوجی جلن تو پاپیوں کے داغوں میں ہوتی ہو گی اور وہ جلن کوئی چاند گرہن پر ہی موقوف نہیں اس کے علاوہ بھی ہو سکتی ہے"۔ لبشو دھا نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔ امرت بابو نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اس کے مُنہ سے کراہنے کی آواز نکلی اور سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر بھیانک شکنیں پڑ گئیں۔ وہ بیمار معلوم ہوتا تھا۔

اُس دن سے امرت بابو کو کسی نے خوش نہ دیکھا۔ لبشو دھا کو دیکھ کر اسکی افسردگی میں اضافہ ہوتا جاتا۔ وہ اکثر اس کی نظروں سے بچنے کی کوشش کرتا

(۴)

بھاگن کی ایک اداس دوپہر تھی۔ امرت بابو تفکرات میں گھرا ہوا چپ

چاپ املی کے پیڑ کے نیچے بینچ پر بیٹھا تھا۔ بیشودھا جو ٹینس کھیل کر ہانپتی ہوئی آ رہی تھی۔ اتفاقاً اس طرف آ نکلی اور امرت بابو کو سراسیمہ پا کر اُس کے قریب ہی گھاس پر بیٹھ گئی "بابو جی! کیا آپ کچھ بیمار ہیں" اس نے پوچھا۔ امرت بابو نے غم آلودہ نگاہوں سے بیشودھا کی طرف دیکھا "بیشودھا میں تمہیں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ بُرا تو نہ مانو گی" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "آپ بلا تامل فرمایئے۔ بابو جی میں بُرا کیوں ماننے لگی" بیشودھا نے نرمی سے جواب دیا۔ "بیشودھا تم جانتی ہو میری یہ حالت کیونکر ہوئی؟ اس نے مری ہوئی آواز سے کہا "نہیں بابو جی"۔ بیشودھا نے جواب دیا۔ امرت بابو آہ بھر کر کہنے لگے "بیشودھا میں صرف تمہاری افسردہ باتوں کی وجہ سے بیمار ہوا ہوں۔ جو شاید تم قصداً میرا دل دکھانے کے لئے کرتی ہو"۔ بابو جی میں پھر کبھی ایسی باتیں نہ کرونگی"۔ بیشودھا نے پشیمان ہو کر کہا "بیشودھا میں تمہیں ملامت نہیں کرتا۔ لیکن ایک التجا کرنا چاہتا ہوں" امرت بابو نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "حکم کیجئے"۔ بیشودھا نے ادب سے جواب دیا۔ "یہ کہ تم میرے سامنے نہ آیا کرو۔ تمہاری شکل و صورت مجھے خوفزدہ کر دیتی ہے۔" امرت بابو گڑگڑا کر کہنے لگا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بابو جی مجھے کلاس میں تو مجبوراً آنا ہی پڑے گا۔ بیشودھا نے سوکھی ہوئی زبان سے کہا"۔ "آہ! لیکن یہ بات مجھے موت کے قریب لے جائیگی" وہ کمزور آواز میں کہنے لگا "پھر یہ گتھی کیونکر سلجھے گی بابو جی"۔ بیشودھا نے پوچھا۔ "تم میرا مضمون خود تیار

کر لیا کرو۔" امرت بابو نے جواب دیا۔

پہلے تو وہ کچھ سوچ میں پڑ گئی پھر اُسے حسرت بھری نظروں سے دیکھ کر کہنے لگی "بہت بہتر، ایسا ہی ہوگا۔" اور اُسے پرنام کر کے چلی گئی اُس دن سے بشودھا نے حساب کا مضمون اپنی ہم جماعت لڑکیوں کی مدد سے تیار کرنا شروع کیا ——— یہ سب کچھ ہوا۔ لیکن امرت بابو کو سکھ نہ ملا۔ اس کے بائیں ہاتھ پر ناسور ہو گیا۔ جو باوجود کئی اپریشنوں کے اچھا نہ ہو سکا۔

ایک دن صبح کا وقت تھا۔ کالج کی پڑھائی شروع ہونے میں ابھی پندرہ بیس منٹ باقی تھے۔ امرت بابو کالج کی طرف آ رہا تھا۔ جونہی اس نے کالج میں قدم رکھا۔ ایک اچھوت عورت جس کے چہرے سے شرارت اور بد چلنی ٹپکتی تھی۔ ایک نوزائیدہ بچے کو لیکر آگے بڑھی اور امرت بابو کو گالیاں دے کر گھسیٹنے لگی شور و غل سُنکر تمام لڑکیاں پروفیسر اور ملازمین وغیرہ جمع ہو گئے۔ ایک اچھا خاصہ مجمع لگ گیا ——— عورت چیخ چیخ کر کہنے لگی "تم نے شادی کے دعدے پر میری زندگی برباد کی مجھے گھر والوں نے نکال دیا ہے۔ میں تمہارے ناجائز بچے کو لیکر کہاں جاؤں۔ اب مجھ سے باقاعدہ شادی کر دیا اس بچے کو کہیں ٹھکانے لگاؤ۔" امرت بابو کا منہ فق ہو گیا۔ "دور ہو چڑیل ہاتھ مت لگا میں نے تو آج سے پیشتر تمہاری شکل تک نہیں دیکھی۔" اس نے حوصلہ کر کے کہا۔ "ہاں بعد میں بدمعاش ایسا ہی کہا کرتے ہیں"۔ عورت نے گرج کر جواب دیا۔ کیا تم ان خطوں

سے بھی انکار کر سکتے ہو" ——— یہ کہتے ہوئے اس نے درجن بھر خطوط مجمع کے سامنے بکھیر دیئے امرت بابو پر گویا بجلی گر گئی۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ وہ دیوار کا سہارا لیکر مجمع کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر اُبلی پڑتی تھیں۔ اور چہرہ لٹک کر ڈراؤنا ہو چکا تھا۔ مجمع دانتوں میں انگلیاں دبائے کھڑا تھا۔ یشودھا جو قریب ہی شدتِ غم سے مرجھائے کھڑی تھی۔ یکایک کڑک کر کہنے لگی "بس ملیا، بس اب تم حد سے بڑھ رہی ہو۔ میں نے تو تمہیں صرف اتنا کہا تھا۔ کہ انہیں ملنے جلنے والوں میں بدنام کرو۔ نہ کہ بھرے مجمع میں اتنی بے عزتی کر کے اُن کو جان سے مار دو ———" عورت ٹھٹک کر یشودھا کو دیکھنے لگی۔ لوگ حیران تھے۔ کہ کیا معاملہ ہے امرت بابو تصویر یاس بنا کھڑا تھا۔ یشودھا فوراً اس کی طرف بڑھی اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی "بابو جی! میں آپ کے خلاف ایسی خوفناک سازش کر کے سخت شرمسار ہوں۔ چونکہ میرا اور آپ کا خط بالکل ایک جیسا تھا۔ میں نے دشمنی کی بنا پر آپ کے نام سے یہ خط لکھکر اس عورت کو دیئے" سب کے دلوں میں یشودھا کی طرف سے نفرت کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے امرت بابو کو جسے غش آنے لگا تھا۔ ہاتھوں پر تھام لیا۔ اور اس عورت کو مار کر بھگا دیا۔ یشودھا کا یہ جُرم کوئی معمولی جرم نہ تھا۔ اس پر چاروں طرف سے لعنتوں کی بوچھاڑ ہونے لگی اور اسی دن اُسے کالج سے جواب مل گیا۔

یشودھا کی اس حرکت سے کیلاش کے دل کو سخت صدمہ ہؤا۔ وہ

دو تین دن تک کسی سے بات چیت بھی نہ کر سکا۔ آخر ایک دن امرت بابو نے اُسے بلا بھیجا۔ جو ابھی بیمار تھا۔ اور چھٹی پر تھا۔ "یشودھا کہاں ہے؟" کیلاش کو دیکھتے ہی امرت بابو نے کہا۔ "میرے سامنے اس کا نام مت لو۔ میں نے اسے کالج سے نکال دیا ہے۔" کیلاش نے افسردگی سے جواب دیا۔ امرت بابو کے دل پر دھچکا سا لگا۔ اس نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "آہ یشودھا سنی۔ یشودھا سورگ کی اپسرا یشودھا دیوی کا روپ بلکہ بھگوان کا اوتار تھی۔ اُسے کالج سے کیوں نکالا گیا؟

"نہیں بابو جی وہ بدکردار لڑکی تھی۔ جو اپنے پہلو میں زہر سے بجھا ہوا دل رکھتی تھی۔" کیلاش نے دکھے ہوئے دل سے کہا۔ "نہیں، نہیں تم غلطی پر ہو۔ اعتراف گناہ اس کا ایک زبردست ایثار تھا۔ جو اس نے میری عزت بچانے کے لئے کیا۔" امرت بابو جوش سے کہنے لگا۔ "آہ میں پاپوں کی آگ میں جل رہا تھا۔ اُس نے اپنے ایثار سے میری روح کو بیدار کر دیا۔ ایک عورت جب دوسرے کے اطمینان کی خاطر اتنی بھاری قربانی کر سکتی ہے تو میں مرد ہو کر کیوں اتنا بزدل ہوں۔ میں ضرور اپنے پاپوں کا پول کھول کر اپنے من کو شانت کرونگا۔"

(۵)

امرت بابو سر جھکائے ہوئے بیٹھا تھا۔ "میں ایک معمولی آدمی کا بیٹا ہوں" اس نے اپنی داستان حیات شروع کرتے ہوئے کہا:

"میری ماں بچپن میں ہی فوت ہو چکی تھی۔ میرا باپ جو کچھ کماتا میری تعلیم

پر خرچ کر دیتا۔ اس نے مجھے اعلیٰ تعلیم دلائی۔ تعلیم ختم کرنے پر میں نے ملازمت کی جستجو کی مگر ناکام رہا۔۔۔۔۔۔ باپ کی زندگی میں مجھے کھانے پینے کی کچھ پرواہ نہ تھی۔ بیکاری نے مجھے آوارہ کر دیا۔ اور میں بدچلنی کے راستے پر پڑ گیا۔"

"باپ کی موت پر میری آنکھیں کھلیں۔ گھر میں پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ اب مجھے روٹی کی فکر ہوئی۔ میرا باپ جگت بابو کی فرم میں پچاس روپے ماہوار پر ملازم تھا۔ میں نے جگت بابو کی منت سماجت کی اور اس نے مجھے میرے باپ کی جگہ دے دی۔ مجھے جو تنخواہ ملتی۔ ہر مہینے اپنی عیاشی پر صرف کر دیتا۔ جگت بابو نیک دل آدمی تھا۔ وہ مجھے ہمیشہ نیکی کے راستہ پر چلنے کی تلقین کرتے۔"

ایک دن میں کسی خاص کام کے لئے اُن کی کوٹھی پر گیا۔ جہاں میں نے ان کی اکلوتی بیٹی جودھا کو دیکھا۔ جودھا کا حسن و جمال کسی تعریف کا محتاج نہ تھا وہ گلستانِ حسن کی نو شگفتہ کلی تھی۔ اس کا پیکر نور کے خمیر سے گندھا ہوا تھا اسے دیکھ کر ایک عارضی شوق اور بے بنیاد ولولہ میرے دل کو گدگدانے لگا۔

——— یہ لڑکی کروڑوں روپے کی واحد مالک تھی۔ میں نے سوچا۔ اگر جودھا سے میری شادی ہو جائے تو میں کتنا دولت مند بن جاؤں۔ چنانچہ اسی خیال سے میں نے بدچلنی کچھ عرصے کے لئے ترک کر دی اور تندہی سے کام شروع کیا چنانچہ میں نے اعلیٰ تعلیم پائی تھی۔ چند ہی دنوں میں ترقی کر گیا۔ ———

——— میں نے انکے کاروبار میں اپنی جان لڑا

دی۔ آخر کار میری امیدیں بر آئیں۔ جودھا کی ماں کے زور دینے پر جگت بابو مجھے جودھا کا رشتہ دینے پر آمادہ ہو گئے۔"

"جگت بابو کی کوٹھی دریائے بیاس کے کنارے تھی۔ جس کے پچھواڑے تھوہر کا جنگل تھا۔ اور اختتام پر ایک پرانے زمانے کا بنا ہوا شکستہ اور ویران گھاٹ تھا۔ اس کے قریب ہی کسی کھنڈر کے آثار تھے —— اسوج کی پہلی تاریخ تھی۔ سردی کے جشن کا تہوار اسی گھاٹ پر منایا گیا۔ میں میلہ دیکھنے کے لئے جگت بابو کی کوٹھی میں موجود تھا۔ جگت بابو نے مجھے تنہائی میں کہا "امرت جودھا کی ماں اس کا رشتہ تمہیں دینا چاہتی ہے کیا تم بھی چاہتے ہو" میں نے جواب دیا۔" اس سے زیادہ میری کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے؟ مگر مجھے تم پر بھروسہ نہیں۔ کیا تم میرے شکوک کو رفع کر سکتے ہو۔" جگت بابو نے مجھے گھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے متانت سے کہا۔" آپ جس طرح اپنا اطمینان کرنا چاہیں کر لیں۔" جگت بابو بولا۔" اچھا آج تم رات کو یہیں رہنا تمہارا امتحان لیا جائے گا۔" میں نے کہا۔" بڑی خوشی ہے۔" —— رات کو دیر تک میں امتحان کا منتظر رہا حتیٰ کہ مجھے نیند آ گئی۔ رات کے دو بجے جودھا کی ماں نے مجھے جگایا۔ کوٹھی میں روشنی نام کو نہ تھی۔ وہ مجھے باہر کھوٹھی کے پچھواڑے لے گئی نہ جانے چودھویں کے چاند کو کیا ہو گیا تھا۔ اس کی سفید کرنیں سیاہی مائل سُرخ ہو کر کائنات کو بھیانک بنا رہی تھیں۔ تھوہر کی جھاڑیاں دھندلی روشنی

میں بھوتوں کی طرح ناچتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں ——— ہم دونوں تھوہر کے جنگل سے گزرتے ہوئے شکستہ گھاٹ پر پہنچے۔ جہاں جگت بابو مع جودھا کے بیٹھا تھا۔ دھندلی چاندنی میں دریا اژدہا کی طرح پھنکارتا ہوا بہ رہا تھا۔ کہیں قریب ہی گیدڑوں کی خوفناک آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں۔ دریا کے پار ایک چتا جل رہی تھی۔ جس کے سُرخ شعلے دھندلی چاندنی میں نارِ جہنم کا نمونہ پیش کر رہے تھے۔ یہ سماں کچھ ایسا ہیبت ناک تھا کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جگت بابو مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "دیکھو، امرت چاند کو کیا ہوا"۔ میں نے چاند کی طرف دیکھا۔ تو وہ سُرخ آہنی گولے کی طرح دہکتا ہوا دکھائی دیا میں کانپ گیا۔ میری بدحواسی دیکھ کر جگت بابو نے دوبارہ کہا۔ لوگ اسے چاند گرہن کہتے ہیں۔ مگر یہ اپنے پاپ کی آگ میں جل رہا ہے۔ امرت جب ایک دیوتا کو پاپ کی ایسی سخت سزا مل سکتی ہے تو پھر انسان کیا چیز ہے" جگت بابو کے منہ سے چاند گرہن کا لفظ سن کر مجھے کچھ ڈھارس ہوئی۔ اگرچہ میں تعلیم یافتہ تھا۔ مگر ماحول کے اثر سے اتنا بدحواس تھا۔ کہ مجھے چاند گرہن کا خیال ہی نہ آیا۔ اور نہ ہی میں نے آج سے پیشتر کبھی چاند کو گرہن لگتے دیکھا تھا ———

——— کامل سکوت کے بعد جگت بابو نے کہا "امرت میں چندربنسی خاندان کا سپوت ہوں۔ ہم لوگ کبھی چندرمہا دیوتا کی پرستش کرتے تھے۔ آج سے پانچہزار سال پہلے جبکہ چندربنسی خاندان کے لوگ دن کو سوتے اور رات کو جاگتے تھے

انہیں بھگنتی کے صلے میں چندر مہا دیوتا کی طرف سے ایک مقدس مہر ملی تھی۔ اور اُن کے اہم معاملات چاند گرہن کے موقع پر اس مہر کی مدد سے طے ہوتے تھے۔ یعنی جو شخص عہد کرتا اُس کے جسم کے کسی حصّے کو اس مہر سے داغ کر نشان بنایا جاتا —— اس مہر کے داغ کی قسم کو دُنیا کی کوئی طاقت نہ توڑ سکتی تھی۔ جو بد عہدی کرتا۔ اس کے داغ میں چاند گرہن کے موقع پر جلن ہونے لگتی۔ اس پر بھی اگر وہ باز نہ آتا۔ تو وہ داغ ناسور بن جاتا اور اسی دُکھ سے اس بد عہد کی موت واقع ہوتی۔ اُس زمانہ سے لیکر وہ مہر چندر بنسی خاندان کے سرداروں میں نسل در نسل منتقل ہوتی رہی —— چنانچہ آجکل وہ مہر میرے قبضے میں ہے اور آج اتفاقاً چاند بھی گرہن میں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس مہر کو اپنے ہاتھ پر داغ کر جودھا سے پیمانِ وفاداری کرو۔ میں دولت کے لالچ سے اندھا ہو رہا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ جگت بابو نے موم بتی کی لو پر وہ مہر گرم کر کے جودھا کے ہاتھ میں دے دی۔ اور عین اس وقت جبکہ میں اس سے وفاداری کا اقرار کر رہا تھا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے مہر میرے ہاتھ پر لگا دی ——

چاند گرہن ہٹنے پر ہم لوگ اشنان کر کے واپس آ گئے۔ اسی ہفتے جودھا سے میری شادی ہو گئی۔ اور ہم دونوں خوش و خرم زندگی بسر کرنے لگے۔ سال ڈیڑھ سال تک ہماری باہمی رفاقت قائم رہی۔ لیکن جگت بابو کی موت

کے ساتھ ہی میری محبت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس عرصے میں میں نے بے شمار دولت جمع کر لی تھی۔ اب جودھا سے چھٹکارا حاصل کرنے کی فکر میں رہنے لگا۔ ایک دفعہ میں اور جودھا کشتی کی سیر کو جا رہے تھے۔ دریا کے کنارے میں نے ایک رنیلی چٹان پر سے جس کے نیچے پانی بہت گہرا تھا۔ جودھا کو دھکا دے کر دریا میں پھینک دیا۔ اور خود چیخ چیخ کر لوگوں کو مدد کے لئے پکارنے لگا۔ مگر یہاں تھا ہی کون جو مدد کو آتا۔ جودھا کی ماں جو کچھ فاصلے پر ہمارے پیچھے آ رہی تھی رونے پیٹنے لگی۔ لیکن بے سود جودھا ڈوب چکی تھی —— تیسرے دن دریا کے بہاؤ پر ایک نعش ملی جس کا گوشت پوست دریائی جانوروں نے نوچ نوچ کر کھا لیا تھا اور اب صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ باقی تھا۔ جودھا کی موت کے بعد میں نے اس کی ماں پر یہ ظاہر کیا کہ جودھا کے بغیر میری زندگی حرام ہو گئی ہے۔ اور اب سنیاس لینا چاہتا ہوں۔

اُس بڑھیا کو دھوکا دے کر میں یہاں چلا آیا۔ اور کوٹھی خرید کر یہیں سکونت اختیار کی اب میں ایک دولتمند آدمی تھا تاہم میں نے روپیہ برباد نہ کیا دولت کیساتھ عزت بھی لازمی چیز ہے۔ سو عزت حاصل کرنے کے لئے میں نے قومی کاموں میں حصہ لینا شروع کیا چونکہ میں عیاش بھی تھا۔ اس لئے آشرموں کو دل کھول کر دان دیتا۔ قوم میری مدّاح تھی۔ میں اکثر آشرموں میں معائنہ کے لئے جاتا جہاں مجھے معصوم لڑکیوں پر ڈورے ڈالنے کا موقع مل جاتا۔

"جودھا کی موت کو کئی مہینے گذر چکے تھے۔ ایک رات کو میرے اس داغ میں جلن ہونے لگی۔ میں گھبرا کر باہر نکلا تو چاند کو گرہن لگا ہوا تھا جب تک چاند گرہن قائم رہا۔ مجھے جلن برابر ہوتی رہی صبح دن چڑھتے ہی میرا خوف دُور ہو گیا۔ اور اسے واہمہ خیال کرکے اپنی کمزوری پر ہنسنے لگا۔ لیکن رات کو اکثر مجھے یہ خیال ستایا کرتا۔ ان دنوں زنانہ کالج میں حساب کے پروفیسر کی جگہ خالی تھی۔ میں نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ اس سے میرا یہی مقصد تھا۔ کہ حسین لڑکیوں کے جھرمٹ میں بیٹھ کر اپنا دل بہلاؤں —— میری یہ تدبیر کامیاب رہی۔ میں اپنے ہاتھ کے داغ کو ایک حد تک بھول گیا۔ میری طبیعت بہت کچھ بدل گئی۔ مگر اس کے بعد ہر چاند گرہن کے موقع پر میرا یہ داغ جلتا رہا۔ اب میں اس جلن کا عادی ہو گیا۔ اور اس کا احساس بالکل جاتا رہا۔ حتےٰ کہ جودھا کی موت کو سترہ سال گذر گئے۔ اس سال پھر اکتوبر میں چاند گرہن ہوا —— اس رات کو جلن سے مجھے بے حد تکلیف ہوئی چونکہ میں بہت مضطرب تھا۔ اس لئے سویرے ہی کالج چلا آیا۔ یہ وہ دن تھا جس دن لبھو دھا کالج میں داخل ہوئی وہ اس وقت اکیلی برآمدے میں کھڑی تھی اُسے دیکھ کر میں سخت خوفزدہ ہوا۔ کیونکہ وہ بالکل جودھا کی ہمشکل تھی۔ میں نے گھبرا کر اس کا نام دریافت کیا۔ اُس نے لبھو دھا کہا ہو گا۔ مگر میری سمجھ میں جودھا ہی آیا۔ خوف و ہراس سے میرے بدن میں رعشہ ہونے لگا۔ میں واپس

چلا آیا اور وہ دن کالج نہ گیا ــــــ یشودھا کے آنے سے میرا اضطراب بہت بڑھ گیا۔ کیونکہ وہ ایسی پُر اسرار باتیں کرتی۔ کہ میرا اعمال نامہ میری آنکھوں کے سامنے آجاتا۔

میں نے اپنا غم غلط کرنے کے لئے پھر عیاشی شروع کر دی۔ انہی ایام میں میری آشنائی ایک اچھوت لڑکی سے ہوگئی۔ اُس کے والدین کو جب یہ علم ہوا۔ تو وہ مقدمہ کی دھمکی دینے لگی۔ چنانچہ ایک شخص کی معرفت میں نے روپیہ دے کر اُن کا مُنہ بند کر دیا ــــــ جس دن مجھے اس لڑکی کے والدین سے معاملہ طے کرنا تھا۔ رات کو میں باغ میں اس شخص سے باتیں کر رہا تھا یشودھا سنگترے کی باڑ کے پیچھے چھپ کر میری باتیں سنتی رہی ــــــ اپنا راز اُس کے ہاتھ میں پا کر میں بہت جھنجھلایا اور اسی رات اُسے قتل کرنے کے ارادے سے ہوسٹل میں گیا۔ مگر وہاں مجھ پر ایک عجیب انکشاف ہوا۔ میں نے قتل کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور اُس دن سے اُس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنے لگا ــــــ اس کی پُر اسرار باتوں میں مطلق فرق نہ آیا اور ان باتوں کا میری صحت پر بہت بُرا اثر ہوا۔ میرے داغ میں ہر وقت جلن رہنے لگی۔ آخر کار میرا وہ داغ ناسور بن گیا ــــــ ادھر ملیا کو (یعنی وہ اچھوت لڑکی جو میری آشنا تھی) والدین نے ننھیال بھیج دیا۔ وہ مجھے وہاں سے خط بھیجتی رہی اور میں اُن خطوں کے جواب دیتا رہا۔ لیکن اُس دن سے

میری اس کی پھر ملاقات نہ ہوئی۔ وہ لڑکی دو سال کے بعد واپس آئی تو حاملہ تھی۔ اب وہ مجھ سے پھر راہ و رسم پیدا کرنے کی خواہاں ہوئی۔ میں نے اُسے دھتکار دیا۔ میرے خط اس کے پاس تھے۔ جب اس کے بچّہ پیدا ہوا تو اس نے دشمنی کی بنا پر مجھے رسوا کرنے کی ٹھان لی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید میری ان تحریروں کے ذریعے وہ اس بچے کو میرا بچہ ثابت کر سکے گی۔ لیکن یشودھا اس وقت میرے آڑے آئی۔ اُس نے میری اور اپنی تحریر ملتی جلتی پا کر سارا الزام اپنے سر لے لیا۔"

(۶)

وقت کا کیڑا سرعت سے زمانے کو چاٹ رہا تھا۔ امرت بابو کو کالج کی پروفیسری ترک کر کے گوشہ نشین ہوئے سال بھر گذر چکا تھا۔ ایک دن ڈاک میں اُسے ایک گلابی رنگ کا لفافہ ملا۔ اس نے فوراً لفافہ چاک کیا خط کی عبارت بالکل مختصر تھی۔

بابو جی نمسکار

مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے۔ براہِ مہربانی جلد از جلد فیروز پور تشریف لائیں۔ کل سے ہر گاڑی کے موقعہ پر آپ کا انتظار کیا جائے گا۔

آپ کی داسی

یشودھا

اتنے عرصے کے بعد یشودھا کی خیریت کی خبر پا کر اُسے بہت خوشی ہوئی اُسے یشودھا سے ملنے کی بے حد آرزو تھی۔ چنانچہ وہ دوسرے دن فیروز پور روانہ ہو گیا۔ گاڑی کا سفر اس نے بمشکل کاٹا۔ ابھی گاڑی اسٹیشن پر پوری طرح کھڑی بھی نہ ہونے پائی تھی کہ وہ کود کر باہر نکلا۔ اُس کا خیال تھا کہ یشودھا اسٹیشن پر موجود ہوگی۔ مگر بجائے اُس کے کیلاش کھڑا تھا۔ امرت بابو نے بدحواسی سے پوچھا۔ "مسٹر کیلاش یہاں کیسے تشریف لائے"! کیلاش نے مسکرا کر جواب دیا۔ "آپ کے استقبال کے لئے" "یعنی آپ مجھے لینے آئے ہیں؟" امرت بابو نے حیرت سے کہا۔ "ہاں آپ کو لینے آیا ہوں۔ یشودھا نے مجھے بھیجا ہے" کیلاش مسکرا کہنے لگا۔ "کل یشودھا سے میری شادی ہونے والی ہے۔ ہم دونوں کی دلی آرزو تھی کہ آپ ہماری شادی میں شریک ہو کر ہمیں اشیرباد دیں"۔

یشودھا کی شادی کا سُنکر پہلے تو غم کی ایک ہلکی سی رَو امرت بابو کے بدن میں دوڑ گئی۔ مگر فوراً ہی اُسے ایک پُرسکون مسرت محسوس ہوئی اُسے اپنے دِل سے ایک بوجھ سا اترتا معلوم ہوا۔ یشودھا کے ہاں پہنچکر وہ بہت خوش ہوا۔ تمام دن یشودھا سے باتوں میں گزر گیا۔ رات کو یہ لوگ سویرے ہی اپنے اپنے کمروں میں جا سوئے۔ کیونکہ صبح تاروں کی چھاؤں میں شادی کی رسومات ادا ہونے والی تھیں۔

امرت بابو اپنے کمرے میں اطمینان سے سو رہا تھا۔ آدھی رات کے قریب اُس نے خواب دیکھا کہ جگت بابو اُسی خوفناک مہر سے اس کا جسم داغ رہے ہیں۔ یکایک اُس کے ناسور میں سخت ٹیس پڑی وہ بے تحاشا چیخ مار کر اُٹھا۔ مگر آنکھیں کھولنے پر اُسے خواب سے بھی زیادہ ہولناک منظر دکھائی دیا۔

میز پر ایک چھوٹی سی موم بتی جل رہی تھی۔ جس کی لَو گل ہونے کے قریب تھی۔ اس مدھم روشنی میں ایک عورت جو بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ دکھائی دیتی تھی۔ اس کا ہاتھ پکڑے زخم کو کچل رہی تھی ——— امرت بابو درد کی شدت سے تلملا اٹھا۔ اس نے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑایا جس پر اس عورت نے خوفناک قہقہہ لگاتے ہوئے دھکا دے کر اُسے پھر پلنگ پر گرا دیا۔

امرت بابو جس کا سر بری طرح پٹی سے ٹکرایا تھا بے ہوش ہو گیا۔

جب اُسے ہوش آیا تو تین آدمی اس کے قریب بیٹھے تھے جن میں ایک ڈاکٹر تھا۔ جو اس کے ہاتھ کی پٹی کر رہا تھا۔ دوسرا کیلاش تھا۔ اور تیسری ایک بوڑھی عورت تھی۔ جس کی شکل وصورت کچھ شناسا سا معلوم ہوتی تھی۔ جب ڈاکٹر پٹی کر چکا تو بوڑھی عورت کمزور آواز میں کہنے لگی۔

"اٹھو بابو! شبو دھا کے لگن کا وقت ہو چکا ہے جا کر اپنے ہاتھ سے کنیا دان

کرو "کنیا دان؟" امرت بابو نے تڑپتے ہوئے پوچھا "ہاں کنیا دان" عورت نے دوبارہ کہا۔ "کیونکہ یشودھا تمہاری اور بدقسمت جودھا کی بیٹی ہے"۔ جودھا کا نام سنتے ہی امرت بابو پھر بیہوش ہو گیا۔ مگر ڈاکٹر کی دوائی سے اُسے بہت جلد ہوش آ گیا۔

"پرماتما کے لئے جلدی بتاؤ یہ کیا معاملہ ہے؟" امرت بابو نے گھبرا کر پوچھا۔ "بابو تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں جودھا کی ماں ہوں" بڑھیا کہنے لگی "جودھا کی ماں؟"۔ اس نے کہا اور اُسے دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگا۔ "ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ میں ابھی تمہیں سارے معاملے سے آگاہ کئے دیتی ہوں"۔ بڑھیا نے کہا "جب تم نے جودھا کو دریا میں پھینکا" —— "میں نے پھینکا؟" امرت بابو نے زخمی کبوتر کی طرح پھڑکتے ہوئے کہا۔ "آہ میں پاگل ہو جاؤں گا" جودھا کی ماں اُسے تسلی دیتے ہوئے کہنے لگی "بابو جی جو کچھ ہونا تھا ہو چکا اب ذرا شانتی سے میری بات سنو۔ دریا میں ڈوب کر جودھا مری نہ تھی۔ دو میل کے فاصلے پر ایک ماہی گیر نے اُسے پکڑ لیا۔ اُس کے دل کی خفیف سی حرکت ابھی جاری تھی۔ ماہی گیر نے دیہاتی طریقے پر اس کا علاج کیا۔ جس سے اس کی جان بچ گئی —— جودھا کی جدائی سے میرا دل ٹوٹ گیا۔ میں اپنا غم غلط کرنے کے لئے دور دور تک جنگل میں نکل جاتی۔ اس حادثہ کو پورے چار مہینے گذر چکے تھے۔ ایک دن میں اپنے غم کی رو میں بہتی ہوئی ایک

گاؤں کی طرف جانکلی جہاں ماہی گیروں کی جھونپڑیاں تھیں۔ ایک جھونپڑی کے دروازے پر جودھا کھڑی تھی۔ میں نے اُسے پہچان لیا۔ لیکن وہ مجھے نہ پہچان سکی۔ کیونکہ وہ اپنی یادداشت بالکل کھو چکی تھی۔ ماہی گیر سے دریافت کرنے پر معلوم ہوُا کہ آج سے چار ماہ پیشتر یہ پگلی اُسے دریا میں بہتی ہوئی ملی تھی"

"جودھا کو پاکر میری دنیا پھر آباد ہو گئی میں اُسے اپنے گھر واپس لے آئی وہ اس وقت سات ماہ سے حاملہ تھی۔ میں نے بڑے بڑے قابل ڈاکٹروں سے اس کا علاج کرایا۔ مگر کچھ فائدہ نہ ہوُا۔ اسی حالت میں اس کے بچّی پیدا ہوئی"

"چونکہ جودھا پاگل پنے میں ہر ایک کو دھکا دے کر قہقہہ لگاتی اس لئے میں نے اندازہ لگایا۔ کہ اُسے دھکا دے کر دریا میں پھینکا گیا تھا چنانچہ اسی لئے میں نے آج تک تمہیں جودھا اور اُس لڑکی کی اطلاع نہ دی حالانکہ تمہارا پتہ مجھے عرصہ سے مل چکا تھا۔ اسی حالت میں ایک عرصہ گزر گیا۔ اتفاقاً جودھا کو ایک دن کہیں سے وہ مہر مل گئی جس سے تمہارا ہاتھ داغا گیا تھا اس مہر کو دیکھ کر نہ جانے اُسے کیا خیال آیا کہ وہ دیر تک سوچتی رہی۔ اُس دن سے وہ تمام دن خاموش رہتی ہے اور رات کو ایک ہاتھ میں موم بتی اور دوسرے ہاتھ میں مہر لیکر پھرتی رہتی ہے۔ اور جو چیز اس کے سامنے آئے موم بتی سے مہر گرم کر کے اُسے داغ دیتی ہے۔ اسی طرح سے اس نے ایک دن بشودھا

کا ہاتھ بھی داغ دیا۔ ———— رات کو تم اپنے کمرے کا دروازہ بند کرنا بھول گئے تھے۔ وہ اتفاقاً ادھر آنکلی اور تمہارے ناسور کو دوبارہ اس نے داغ دیا۔"

بڑھیا کی یہ بات سن کر رات والا خوفناک منظر اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ اس کے ہاتھ میں زیادہ درد ہونے لگا۔ اس نے کراہتے ہوئے کہا۔ "اوہ اب کیا ہوگا۔ اس نے میرا ہاتھ دوبارہ داغ دیا ہے۔"

اسے خوفزدہ پاکر بڑھیا نے کہا۔ "امرت بابو، اس مہر کا بالکل تشویش نہ کرو۔ یہ جودھا کے پتاجی کی دماغی اختراع تھی۔ چونکہ وہ تمہاری طرف سے مطمئن نہ تھے۔ اور میں مصر تھی کہ جودھا تمہیں کو ملے۔ اس لئے انہوں نے ایک ڈراؤنے ماحول میں اس مہر سے ایک روایت منسوب کر کے اس کو تمہارے ہاتھ پہ داغ کر تم سے پیمانِ وفا لیا۔ یہ سب کچھ صرف تمہیں ڈرانے کے لئے تھا۔ ورنہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔"

"کیا بیشو دھا کو یہ معلوم ہے کہ میں اس کا باپ ہوں" امرت بابو نے آہ بھر کر دریافت کیا۔ "ہاں معلوم ہے۔ بڑھیا نے کہا۔ اسی لئے وہ تمہارے کالج میں داخل ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا۔ کہ وہ تمہیں راہِ راست پر لے آئے گی۔"

امرت بابو سخت شرمسار تھا۔ لیکن بڑھیا کے کہنے پر اس نے کنیا

دان کی سب رسومات اپنے ہاتھ سے ادا کیں۔

(۷)

امرت بالو کے ملاپ سے رفتہ رفتہ جودھا کا پاگل پن جاتا رہا۔ جس بیماری کو بڑے بڑے قابل ڈاکٹر نہ رفع کر سکے تھے۔ قدرت نے اس کا علاج کر دیا۔ وہ دوبارہ صحیح الدماغ ہو گئی ۔ امرت بالو کا ناسور بھی آہستہ آہستہ بھر گیا۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا۔ کہ یہ زخم جلانے سے اچھا ہو گیا ہے۔

بیساکھی کا تہوار تھا۔ کائنات کا دامن بہار کی نیرنگیوں سے بھرپور تھا۔ ہوا نشہ برسا رہی تھی۔ ہر برگ و بار کیف میں ڈوبا ہوا تھا۔ سبزہ کی دلکشی دلوں کو مسحور کر رہی تھی۔ جگت بالو کی قدیم کوٹھی میں شادمانی کے گیت گائے جا رہے تھے۔ امرت بالو اپنے کنبے میں شادان و فرحاں بیٹھا ہوا تھا۔ کیلاش اور لیشو دھا میں ایک مزیدار بحث چھڑی ہوئی تھی۔ کیلاش کا دعوےٰ تھا کہ امرت بالو کا ناسور واہمہ کے اثر سے تھا۔ مگر لیشو دھا کہتی تھی کہ "نہیں، یہ ماتا جی کی قوتِ ارادی کا کرشمہ تھا" —— دونوں اپنی اپنی جگہ سچے تھے۔

جودھا اور امرت بالو اپنے نونہالوں کی دلچسپ گفتگو سے باغ باغ ہو رہے تھے۔ آخر کار جودھا نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا "تم دونوں غلطی پہ ہو یہ صرف ایک مہاپرش کی عاقلانہ تدبیر تھی۔ جو ایک دن کامیاب ہو کر رہی"۔

بلائے ناگہاں

کھجیارہ
مارچ ۱۹۳۸ء

حیدر میرا بچپن کا دوست تھا۔ ہم دونوں ایک ہی محلہ میں رہتے تھے اور دونوں نے ایک ہی سکول میں تعلیم پائی تھی۔ سکول چھوڑنے کے بعد اس نے کچھ کی تجارت اختیار کی اور اس تجارت کی وجہ سے اُس کی بیشتر زندگی کافرستان میں گزری اب وہ ایک دولتمند شخص کی حیثیت سے آرام و آسائش کی زندگی بسر کر رہا تھا ــــــ مگر باوجود اس آسودہ حالی کے اس کی زندگی غیر مطمئن معلوم ہوتی تھی۔ وہ ہر وقت کھویا کھویا سا رہتا۔ اُسے کسی کام میں دلچسپی

نہ تھی۔ وہ سوسائٹی سے متنفر تھا۔ سوائے میرے کسی سے زیادہ میل جول نہ رکھتا تھا۔ میں نے کئی دفعہ ارادہ کیا۔ کہ اسکی افسردگی کا راز معلوم کروں مگر موقعہ نہ ملا۔ ایک دفعہ فصل کے موقعہ پر میرا اپنے حصہ داروں سے کچھ جھگڑا ہو گیا۔ اور مجھے اپنے گاؤں جانا پڑا ——— وہاں جا کر میں زمینداری کی بندھنوں میں ایسا گرفتار ہوا۔ کہ دو سال تک چھٹکارا نہ ہوا۔ اس عرصہ میں حیدر سے میری خط و کتابت جاری تھی۔ اسکے خطوں سے اکثر وحشت اور مایوسی کا جذبہ ٹپکتا تھا۔ دو سال بعد جب میں واپس آیا۔ تو میں نے سُنا کہ حیدر بالکل گوشہ نشین ہو گیا ہے۔ ——— دو تین دن تو گھر کے معمولی کام کاج میں صرف ہو گئے۔ تیسرے دن شام کے قریب میں اس کے گھر گیا۔ میرا لڑکا میرے ہمراہ تھا۔ حیدر کی حالت دیکھ کر مجھے دلی صدمہ ہوا۔ وہ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ بن رہا تھا۔ اس کا رنگ مٹیالا اور جلد بدنما طور پر خشک ہو رہی تھی۔ اُس کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں سے خوف و ہراس کی علامات ظاہر تھیں ——— مجھے دیکھ کر ایک مُردہ سی مُسکراہٹ اس کے پژمردہ ہونٹوں پر کھیل گئی۔ میں اُسے دیر تک حیرت سے تکتا رہا۔ میری حالت سے آگاہ ہو کر وہ مری ہوئی آواز سے کہنے لگا۔ "کیا دیکھ رہے ہو؟" میں خاموش رہا۔ وہ دوبارہ بولا۔ "آہ! تم نہیں جانتے میری زندگی کس عذاب میں ہے میں نے آج تک اپنا راز تم سے پوشیدہ رکھا۔ مگر اب زیادہ دیر تک یہ میرے دِل میں نہیں رہ سکتا میں

اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں ——"

(۲)

سلیم کمرے سے ملحقہ لائبریری میں رنگین پنسلوں سے تصویریں بنانے میں مصروف تھا۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ حیدر کہنے لگا۔ سکول چھوڑنے کے بعد میری دوستی ایک ایسے شخص سے ہوئی۔ جو کافرستان میں کٹھ کی تجارت کرتا تھا۔ یہ شخص انتہائی نیک نفس اور دوست نواز تھا۔ وہ دنیا میں بالکل اکیلا تھا اور تجارت کا کام انجام دینے میں اُسے بہت دقت ہوتی تھی اس لئے اُسے ایسے آدمی کی تلاش تھی جو اس کے ماتحت کافرستان کے علاقہ میں دورہ کرکے کٹھ فراہم کرنے میں اس کی مدد کرے —— ان دنوں میری عمر صرف اٹھارہ برس کی تھی۔ میں بالکل ناتجربہ کار تھا۔ تاہم اس نے مجھے دیانت دار اور محنتی پاکر تجارت میں حصّہ دار بنا لیا۔ اور میں نے اپنا کام اس قدر شوق اور محنت سے کیا کہ سال کے اندر اندر ہماری تجارت چمک اٹھی —— انہی ایام میں ایک دفعہ میں اپنے کوہستانی ملازم کے ہمراہ دورہ کرتا ہوا رستہ بھول کر ایک غیر آباد علاقہ میں جا پہنچا۔ گو یہ علاقہ نہایت سرسبز تھا۔ میوے سے لدے ہوئے درخت ہماری خوراک کے لئے بکثرت موجود تھے۔ اور پیاس بجھانے کو جگہ جگہ پر حیات بخش چشمے جاری تھے لیکن رات کو سر چھپانے کے لئے جگہ ملنی دشوار تھی —— تمام دن

ہم جنگلوں میں بھٹکتے رہے۔ حتیٰ کہ شام قریب ہوگئی شکست خوردہ آفتاب دن بھر کی خجالت سے زرد رُو ہوکر لیلائے شب کی سیاہ زلفوں میں مُنہ چھپانے لگا۔ جنگلی پرندے شور وغل مچاتے ہوئے اپنے گھونسلوں کے اردگرد طواف کرنے لگے اور گھنے درختوں کی وجہ سے جنگل بے حد تاریک ہونے لگا——

ہم اندھا دھند آگے بڑھتے گئے یکایک جنگل ختم ہو گیا۔

ہم تاریک فضا سے باہر نکلے تو افق کے دلکش مناظر سے ہماری آنکھیں روشن ہوگئیں۔ ہم ایک شاداب و زرخیز میدان کے کنارے کھڑے تھے۔ کہیں دُور سے روشنی دکھائی دے رہی تھی ہم اس طرف بڑھے اور تھوڑی دیر میں ایک جھونپڑی کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے——جھونپڑی میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ دودکش سے دھوئیں کے بلغارے نکل رہے تھے۔ اور بھُنے ہوئے گوشت کی خوشگوار مہک اٹھ رہی تھی۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے دستک دی ایک خشک رُو منحوس صُورت شخص نے دروازہ کھولا۔ میں نے رات بسر کرنے کی درخواست کی۔ اس نے ہم دونوں کو سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا۔ پھر ایک خوفناک قہقہہ لگاتے ہوئے اندر آنے کا اشارہ کیا——

اس خوفناک قہقہے سے میرا دل ہل گیا۔ طرح طرح کے وسوسے اٹھنے لگے۔ مگر تھکان سے مجبور ہو کر چپ چاپ اس کے پیچھے ہو لیا جھونپڑی کی اندرونی حالت بہت ۔ڈی تھی۔ دیواریں دھوئیں سے سیاہ ہو رہی تھیں ہر چیز

پر سیاہی مائل گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اس نے ہمیں ایک شکستہ تخت پر بٹھایا۔ اور خود ہمارے کھانے کے بندوبست میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں اس نے بُھنا ہوا گوشت اور مکّی کی روٹیاں لا کر ہمارے سامنے رکھ دیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر میرے ملازم نے میرا بستر ایک طرف لگا دیا۔ مگر میرا دل سونے کو نہ چاہتا تھا۔ مجھے اس منحوس صورت آدمی کی آنکھوں میں شقاوت مسکراتی دکھائی دیتی تھی۔ اس بدگمانی کے زیر اثر میرے دل میں ایک نامعلوم خطرہ پیدا ہو چکا تھا۔ میں اسی سوچ میں تھا کہ وہ قہوہ لے آیا۔ نیند کو دُور کرنے کے لئے میں نے خوب قہوہ پیا —— تھوڑی دیر کے بعد مجھے سخت نیند کے جھونکے آنے لگے۔ میں نے چاہا کہ ملازم کو خبردار رہنے کی تاکید کر کے خود سو جاؤں۔ مگر دیکھا تو وہ پہلے ہی گہری نیند کے مزے لے رہا تھا۔ میں نے اُسے آوازیں دیں۔ جھنجھوڑا مگر بے سود۔ مجھ پر نیند کا غلبہ زیادہ ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اردگرد کی چیزیں دھندلی نظر آنے لگیں۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا —— رات کو مجھے نہایت خوفناک خواب دکھائی دیئے۔ میں نے دیکھا کہ چند دیوزاد آدمی مجھے کندھے پر اٹھائے ہوئے کہیں لیجا رہے ہیں۔ یکایک میرے سر میں سخت ٹیس اٹھی۔ ایک تشنجی کیفیت سے میرے پٹھے اینٹھنے لگے۔ دورانِ خون سر کی طرف زیادہ ہونے سے دماغ پھٹنے لگا۔ سخت تکلیف سے میری آنکھ کھل گئی۔ اُف! خدا کی پناہ! میں نے ایک ایسا نتیجہ

منظر دیکھا کہ میرا خون خشک ہو گیا۔ بدن کے رونگٹے سوئیوں کی طرح کھڑے ہو گئے اور دل ایک بڑے کلاک کی مانند ٹک ٹک کرنے لگا —— آہ! میں ایک نیم روشن اور ڈراؤنی غار میں ایک لمبی سی چوبی میز پر چت پڑا ہوا تھا۔ میری مشکیں کسی ہوئی تھیں اور سرہانے کی طرف ایک زبردست الاؤ جل رہا تھا۔ دہکتے ہوئے انگاروں کی سُرخ تھرکتی ہوئی روشنی میں دیواروں پر مہیب سائے ناچ رہے تھے۔ غار دوزخ کی بھٹی کی طرح لال اور گرم تھی سخت گرمی سے میرا سر چکرا رہا تھا —— میز کے قریب ایک دیوزاد آدمی کھڑا تھا جس کا بالوں سے بے نیاز سر ایک پشاوری تربوز کی طرح بڑا تھا۔ اس کا سُرخ چہرہ جس پر جلاّدوں کی طرح بڑے بڑے سیاہ لمبے گلمچھے تھے۔ انگاروں کی لال روشنی میں خون سے رنگا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ ہاتھ میں ایک لمبا شکاری چاقو پکڑے کسی کو کچھ احکام دے رہا تھا۔ انتہائی وحشت سے میری زبان حلق میں دھنس گئی اور سانس رُک رُک کر آنے لگی —— اتنے میں ایک نسوانی آواز سُنائی دی۔ جسے سنتے ہی سُرخ چہرہ جلاّد نے اپنا مضبوط ہاتھ اٹھایا۔ اور چاقو سے میرے سر میں گھاؤ لگانے لگا۔ میں شدّتِ خوف سے پہلے ہی نیم جان ہو رہا تھا۔ زخموں کی تکلیف سے بے ہوش ہو گیا۔

(۳۱)

مجھے ہوش آیا تو میں ایک صاف ستھرے کشادہ کمرے میں ایک آرام

وہ بستر پر پڑا تھا۔ کمرے میں بالکل سکوت تھا۔ ایک طرف آبنوسی ڈیوٹ پر رکھے ہوئے پیتل کے بڑے چراغ میں پلیل جل رہا تھا جس کے کیف آور روشنی عطر کے قرابے لنڈھا رہی تھی۔ چاند کی حسین کرنیں کھلی کھڑکی سے داخل ہو کر فرش زمین پر لوٹ رہی تھیں۔ میرے سر اور گردن کے پٹھے اکڑے ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ مجھے سب واقعات یاد آنے لگے۔ اور غار والا منظر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ میں نے گھبرا کر ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ سرہانے کی طرف ایک سایہ سا دیکھ کر میری چیخیں نکل گئیں۔ فوراً کسی نے شفقت بھرا ہاتھ میرے سینے پر رکھ کر ٹوٹی پھوٹی پشتو میں کہا۔ طالع مند نوجوان تمہیں اپنی زندگی اور جوانی مبارک ہو۔ تمہاری اس طویل اور مسلسل غشی نے مجھے تمہاری زندگی سے مایوس کر دیا تھا۔ مگر آج آٹھ دن کے بعد تمہیں ہوش میں دیکھ کر بہت خوش ہوں خدا کا شکر ہے کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔ اب کچھ فکر نہیں تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے ——— دلجوئی کے الفاظ سن کر میں نے مطمئن نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک چالیس سالہ وجیہہ اور شکیل آدمی تھا۔ اُس نیک دل انسان کی بڑھی ہوئی ہمدردی اور اَن تھک خدمت گذاری۔ سے میری صحت بہت جلد عود کرنے لگی اور میں بتدریج صحت یاب ہو گیا ——— دوران علالت میں مجھے معلوم ہوا کہ میرے محسن کا نام جواں بخت ہے اور وہ ایک قبیلے کا سردار ہے میرے استفسار پر جواں بخت نے مجھے ایک عجیب وغریب

داستان سنائی اُس نے کہا" اس علاقہ میں کئی ایک ایسی وادیاں ہیں۔ جو ہنوز دنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ ہر ایک وادی کا راستہ اتنا خفیہ اور پُراسرار ہے۔ کہ کوئی اجنبی اُن میں داخل نہیں ہو سکتا اور ہر وادی میں جدا جدا قبیلے آباد ہیں۔ چنانچہ یہ وادی بھی جس میں میرا قبیلہ بھی آباد ہے اسی طرح ایک پوشیدہ وادی ہے۔ اور یہاں سے ایک دن کی مسافت پر ایک اور ایسی ہی پوشیدہ وادی ہے جس میں ایک رہزنوں کا قبیلہ آباد ہے اُنکی سردار ایک عورت ہے۔ جس نے جوانی کا جوہر ایجاد کیا ہے۔ اٹھارہ سے پچیس سال تک کی عمر کے نوجوانوں کے سر سے وہ اس جوہر کو کیمیاوی طریقے سے حاصل کرتی ہے۔ اور اس جوہر کے اثر سے باوجود سن رسیدہ ہونے کے ابھی تک جوان اور نوخیز نظر آتی ہے اس جوہر کو حاصل کرنے کے لئے اس نے اپنے ملازم مختلف علاقوں میں اس غرض کر چھوڑ رکھے ہیں کہ وہ کسی طرح نوجوانوں کو اس کے لئے فراہم کریں ——— ان اسیر نوجوانوں کو اس کے ملازم منشیات سے بے ہوش کر کے خفیہ غاروں میں لے جاتے ہیں۔ جہاں وہ عورت ان کے سروں سے جوہر کشید کرتی ہے۔" میں نے پوچھا" آپ کو یہ باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟" اُس نے کہا۔ "جوانی میں مجھے بھی ایک دفعہ اس کے آدمی پکڑ کر لے گئے تھے۔ لیکن میرے قبیلے کو اس غار کا کسی طرح کھوج مل گیا۔ اور اس نے شبخوں مار کر مجھے عین اس وقت چھڑا لیا۔ جبکہ ایک سُرخ چہرہ جلاد میرے سر کو

زخمی کر رہا تھا"۔ ———— جواں بخت نے کلاہ اتار کر اپنا سر مجھے دکھایا جس پر جا بجا بڑے بڑے سفید داغ تھے۔ پھر کہنے لگا "میں نے اب اس علاقہ میں اپنے جاسوس چھوڑ رکھے ہیں جب کوئی نووارد اُن کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ تو مجھے اطلاع مل جاتی ہے اور میں چھاپہ مار کر ان نوجوانوں کو بچا لیتا ہوں۔ مگر وہ عورت احتیاطاً غاریں بدلتی رہتی ہے مگر میں ہمیشہ کھوج لگانے میں کامیاب ہو جاتا ہوں۔ چنانچہ جس دن رہزن تمہیں اُس ڈائن کے پاس لے جا رہے تھے۔ مجھے جاسوسوں نے مطلع کیا جس پر میں نے کئی ایک غاروں میں تمہیں تلاش کیا۔ اور آخر کار ایک غار پر حملہ کر کے تمہیں نجات دلوائی۔ میں کئی دفعہ اس عورت پر حملہ کر چکا ہوں مگر وہ ہر دفعہ میرے ہاتھ سے بچ کر صاف نکل جاتی ہے۔ کاش مجھے اس کی وادی کا راستہ معلوم ہو جائے اور میں ہمیشہ کے لئے دنیا کو اس ڈائن کے وجود سے پاک کر دوں۔

(۴)

میں تقریباً چھ ماہ جواں بخت کی وادی میں مقیم رہا۔ کئی دفعہ واپسی کا ارادہ کیا۔ مگر اُس کی بے لوث محبت میرے لئے زنجیر پا ہو گئی۔ چھ ماہ بعد میں نے دل کڑا کر کے اس سے اجازت طلب کی۔ وہ کچھ سوچ کر بے دلی سے کہنے لگا۔ تم شوق سے جا سکتے ہو مگر تمہیں یہاں سے آنکھوں پر پٹی باندھ کر جانا ہو گا۔ میں گھبرا کر کہا "یہ کیوں؟" وہ لجاجت سے بولا "عزیز من تمہیں پہلے

بتا چکا ہوں کہ یہ ایک پوشیدہ وادی ہے۔ اس لئے سوائے اپنے قبیلے کے کسی اور کو ان خفیہ راستوں کا راز بتانا ہمارے اصول کے خلاف ہے۔ اگر اس اصول میں بے قاعدگی کی وجہ سے نقصان کا سخت خطرہ ہے ——

کیونکہ اگر ایک قبیلے کو دوسرے قبیلے کی وادی کا راستہ معلوم ہو جائے تو وہ شبخون مار کر وادی میں گھس آتے ہیں اور قبیلے کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں گو مجھے تم پر کوئی بدگمانی نہیں مگر اپنے قبیلے کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ اُنکے قائم کردہ اصول کی خلاف ورزی میری طاقت سے باہر ہے۔ میں نے افسردگی سے کہا۔ تو پھر میں یہاں کبھی نہ آسکوں گا؟" میرے خیال میں کبھی نہیں"۔ اس نے کہا۔ میں نے کہا" لیکن آپ کی ملاقات"۔ وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ یہ بھی تقریباً ناممکن ہے —— اس ناگوار گفتگو نے مجھے مایوس کر دیا۔ مجھے اس سے دلی الفت تھی۔ اس لئے اس کے فیصلے سے میرے دل پر گہری چوٹ لگی اور میرے آنسو جاری ہو گئے۔ وہ رویا تو نہیں مگر اُس کے چہرے کا اڑتا ہوا رنگ اُس کے اضطراب کا شاہد تھا۔ وہ گاؤ تکیے پر کہنیاں ٹیکے کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کے شگفتہ چہرے پر سماوی تجلیاں نمایاں تھیں ——

کامل وقفہ کے بعد اُس نے سر اٹھایا اور اپنی نکھری ہوئی منور پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نہایت ملائمت سے کہنے لگا۔ ہاں ایک صورت ہو سکتی ہے اگر تم میرے مذہبی طریقے پر قسم اٹھا کر میری برادری میں شامل ہو جاؤ۔ تو میرے

قبیلے کو اطمینان ہو جائے گا۔ میں نے اس شرط کو فوراً منظور کر لیا ــــــــ
دوسرے دن جواں بخت نے اپنے تمام قبیلے کی دعوت کی اور سب کے سامنے ایک نیم عریاں کاہن نے جواں بخت کی چھنگلیا سے چند قطرے خون نکال کر ایک طشتری میں ٹپکائے۔ پھر اپنی خاص زبان میں اس خون پر مجھ سے قسم لی گئی۔ جس کا مفہوم یہ تھا۔ کہ اگر میری وجہ سے جواں بخت کو کسی قسم کی تکلیف پہنچے تو روحیں مجھے بھی وہی سزا دیں۔ اس کے بعد نیم عریاں کاہن کی ہدایت کے موجب میں نے اس مقدس خون کو چکھا اور اس رسم کے اختتام پر جواں بخت نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ اسکے بعد قبیلے کے سب لوگ یکے بعد دیگرے میرے گلے ملے اور خوشیاں مناتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ اگلے دن مجھے وادی کا راز بتا دیا گیا۔ اور جاتی دفعہ جواں بخت نے تاکید کی کہ جب تک میری عمر ۲۵ برس سے تجاوز نہ کر جائے اس علاقہ میں اکیلا یا کسی اجنبی کے ہمراہ سفر نہ کروں۔ جواں بخت کے خاص آدمی مجھے اس جگہ پہنچا گئے۔ جہاں میرے حصہ دار کا ہیڈ کوارٹر تھا ــــــــ
یہ خطہ جواں بخت کی وادی سے دو سو میل کے فاصلے پر تھا۔ میرا حصہ دار جو میری زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ مجھے زندہ سلامت پا کر بہت خوش ہوا ــــــــ جواں بخت کی دوستی سے میری تجارت کو بہت فائدہ پہنچا۔ کیونکہ جواں بخت کی وادی میں کٹھ بہت کثرت سے پائی جاتی تھی۔ اس کے آدمی ہمیشہ کٹھ پہنچانے پہنچتے انہی آدمیوں کے ساتھ میں بھی ہر دوسرے تیسرے مہینے جواں بخت سے

ملنے جایا کرتا۔ اسی طرح کئی سال گزر گئے۔ میری عمر ۲۵ برس سے تجاوز کر گئی۔ اب میں بغیر محافظوں کے بے کھٹکے اس علاقہ میں سفر کرنے لگا ——

ایک دفعہ میں جوان بخت کو ملنے جا رہا تھا۔ راستے میں ایک چھوٹی سی کوہستانی سرائے میں میری ایک خوش پوش مسافر سے ملاقات ہوئی یہ شخص بڑا باتونی تھا۔ باتوں ہی باتوں میں اس نے ذکر کیا کہ فلاں راستے سے آتے ہوئے کئی دفعہ اس ندی کے کنارے جو نشیبی گھاٹی کے عمق میں ہے اس نے پریوں کو گاتے دیکھا ہے۔ اسوقت تو میں نے اُسے جھٹلا دیا۔ مگر دُوسرے دن سفر کرتے ہوئے راستے میں مجھے اس ندی کا خیال آیا۔ جو یہاں سے زیادہ دور نہ تھی۔ میں نے گھوڑا اس راستے پر ڈال دیا —— ندی کے کنارے گیا تو کہیں دُور پار سے ہلکی ہلکی دلکش آواز جو نسیم بہار کی نرم رو لہروں پر مستی بکھیر رہی تھی۔ سُنکر میرے دل میں گدگدی پیدا ہونے لگی۔ میں نے گھوڑا آگے بڑھا دیا۔ برساتی ندی میں پانی بہت کم تھا۔ میں باآسانی اُسے عبور کر کے پار کے گھنے جنگل میں داخل ہو گیا۔ اب گیت کہیں قریب ہی سنائی دیتے تھے —— یہ نشاط انگیز راگنی مجھے اپنی طرف اس طرح کھینچ رہی تھی۔ جس طرح مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے آگے بڑھکر معلوم ہوا کہ جنگل کے وسط سے کاٹ کر چھوٹا سا میدان بنایا گیا ہے اور اس میدان میں ایک خوشنما جھونپڑی ہے جس کے ارد گرد خوش رنگ پھلواڑیوں کی بساط بچھی ہوئی ہے۔ قریب گیا تو فرطِ حیرت سے

میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں ——— سوسن کی پھلواڑی میں ایک پری جمال حسینہ ایک پہاڑی ساز پر دلکش لے میں گیت گا رہی تھی۔ اور چند کوہستانی لڑکیاں پاؤں میں گھنگرو باندھے اس کے سامنے ناچ رہی تھیں۔ اس حسینہ کو دیکھ کر میں پھڑک گیا۔ اس کی بڑی بڑی خوشنما صدفی آنکھوں سے ایک ایسا کیف کا سیلاب اُمڈ رہا تھا۔ جس کی تیز رو میں میرے ہوش و حواس تک بہہ گئے ——— مجھے دیکھکر انہوں نے راگ رنگ ختم کر دیا۔ حسینہ نے مجھے بلا کر بڑے اخلاق سے اپنے قریب بٹھایا اور ٹوٹی پھوٹی پشتو میں باتیں کرنے لگی۔ جب میرے حواس قدرے درست ہوئے۔ تو میں نے اس حسینہ سے نام وغیرہ دریافت کیا۔ وہ کہنے لگی میرا نام مہ لقا ہے۔ میں ایک کوہستانی رئیس کی لڑکی ہوں۔ والدین کے انتقال پر میرا دل ٹوٹ چکا ہے یہ جگہ کبھی میرے باپ کی شکار گاہ تھی۔ یہاں اپنی کنیزوں کے ساتھ زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں ———

میں نے تمام دن اس حسینہ کی صحبت میں گزارا۔ خوشی کے لمحے چٹکیوں میں گزر جاتے ہیں۔ حتےٰ کہ دن کی ڈھلتی چھاؤں وقت کی رفتار کا پتہ دینے لگی مہ لقا سے رخصت ہو کر جواں بخت کی وادی کی طرف ہو لیا۔ میں ابھی تک محبت کی چاشنی سے نا آشنا تھا۔ آج پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ میں اپنا دل اس لڑکی کو دے چکا ہوں۔ جواں بخت کی ملاقات کے بعد میں اپنے ڈیرے پر واپس

تو مہ لقا کی جدائی دن بدن مجھے شاق گزرنے لگی۔ بہت کوشش کی کہ اس کو بھول جاؤں مگر دل نہ مانتا اور آخر کار اپنے کاروبار سے بد دل ہو کر زیادہ تر جواں بخت کے پاس رہنے لگا۔ جواں بخت میری اس تبدیلی پر متعجب تھا لیکن میں نے بڑی خوش اسلوبی سے اپنے عشق کا راز اس سے چھپائے رکھا۔

مہ لقا کی جھونپڑی جواں بخت کی وادی سے کچھ زیادہ دور نہ تھی۔ اس لئے اکثر اُس سے ملاقات ہوتی رہتی تھی وہ اکثر جائے رہائش دریافت کیا کرتی۔ مگر میں نے کبھی اس سے جواں بخت کا ذکر نہ کیا۔ اُسے ہمیشہ اپنے ڈیرے کا پتہ دیتا۔ جو میرے کاروبار کا مرکز تھا۔ یہ سنکر وہ بدگمانی سے منہ پھیر لیا کرتی۔ کیونکہ وہ ڈیرا یہاں سے تقریباً دو سو میل کے فاصلے پر تھا ——— ایک دن جبکہ میں اسے اپنی محبت کا یقین دلا رہا تھا۔ وہ بے اعتباری سے کہنے لگی "تمہاری محبت کا میں کیسے یقین کر سکتی ہوں۔ جبکہ تم اپنی جائے رہائش تک مجھ سے چھپا رہے ہو"۔ ندامت سے جھٹ بے سمجھے بوجھے میرے مُنہ سے نکل گیا "دوسرے کا راز میں نہیں بتا سکتا" میرے اس جواب پر وہ اپنی حسین آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی آہ آپ مجھے اس قدر ذلیل سمجھتے ہیں۔ کیا میری ذات سے کسی کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے ——— درحقیقت آنسو عورت کا زبردست ہتھیار ہے۔ جسے دیکھکر مضبوط سے مضبوط ارادے کا مرد بھی زیر ہو جاتا ہے۔ آہ۔ میں بھی ان صدفِ فان گوہر بار ——— کو دیکھ کر بے تاب ہو گیا اور ان خوشنما آنسوؤں نے مجھے مغلوب

کر دیا۔ افسوس میں نے اپنا مقدس عہد توڑ کر اُسے اس وادی کا راز بتا دیا۔

(۴)

رات کسی بدعہد گنہگار کے دل کی طرح تاریک تھی ہجس کی نحوست سے کائنات دھواں دھار ہو رہی تھی۔ تیسری تاریخ کا نیا چاند افق کی تاریک گہرائیوں میں کھو چکا تھا۔ تارے سیاہ بادلوں میں گم ہو چکے تھے۔ تمام دُنیا ایک کالے دیو کی مٹھی میں بند معلوم تھی۔ جواں بخت اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا۔ مگر میری آنکھوں میں نیند مفقود تھی۔ ایک نامعلوم خطرہ مجھے قریب تر معلوم ہو رہا تھا۔ کسی مبہم خوف سے میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میں جہنمی اذیت محسوس کرتے ہوئے اپنے کمرے میں بے چینی سے چکر لگا رہا تھا ——— آدھی رات کے قریب یکایک ایک گرجدار آواز سے تمام وادی گونج اُٹھی۔ اس پُرہول ... آواز سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ آہ یہ اُس مہیب نقارے کی آواز تھی جس پر خطرے کے وقت چوٹ پڑتی تھی۔ خطرے کے الارم پر تمام قبیلہ بیدار ہو گیا۔ جواں بخت کے گھر میں کھلبلی مچ گئی۔ اُس نے نہایت عجلت سے ہتھیار لگائے اور مقابلے کے لئے تیار ہو گیا ———

یکدم رہزنوں کا ایک زبردست گروہ جواں بخت کے محل پر ٹوٹ پڑا۔ وہ کمال بہادری اور جوانمردی سے لڑا مگر رہزنوں کے ٹڈی دل کے سامنے اُس کی پیش نہ گئی۔ وہ مجروح ہو کر گر پڑا۔ رہزنوں نے اسکے ساتھ ہم سب

کی مشکیں کس لیں اور ہمیں برق رفتار گھوڑوں پر لاد کر وادی سے نکال لائے ——— ابھی وہ وادی سے نکلے ہی تھے۔ کہ جواں بخت کا باغی قبیلہ تعاقب کرتا ہوا آپہنچا۔ چند میل کے فاصلے پر دونوں لشکر آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ اِدھر میدان کارزار گرم ہو رہا تھا۔ اُدھر ہم قیدیوں کو ایک غار میں پہنچا دیا گیا۔ غار میں الاؤ جل رہا تھا۔ اور ایک بھرے ہوئے شیر کے پنجرے کے قریب ایک عورت کھڑی تھی۔ اُس عورت کو دیکھ کر میں حیرت واستعجاب سے اچھل پڑا۔ آہ وہ مہ لقا تھی ——— وہ غصے سے دانت پیس رہی تھی۔ حالت غیظ میں اسکی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ ایک کونے میں وہی خوش پوش مسافر کھڑا تھا۔ جو کبھی مجھے سرائے میں مل چکا تھا۔ جس نے مہ لقا کے اشارہ ابرو پر جواں بخت کی مشکیں کھولیں اور اُسے خوفناک شیر کے پنجرے میں ڈال دیا جب شیر نے آناً فاناً جواں بخت کو اپنی مضبوط رانوں میں دبوچ کر ہلاک کر دیا۔

——— عین اسی وقت رہزنوں کے لشکر میں بھاگڑ پڑ گئی اور حملہ آور مار دھاڑ کرتے ہوئے غار کے قریب پہنچ گئے۔ خطرے کو بھانپ کر مہ لقا فوراً غار سے باہر نکلی اور اپنی جماعت سمیت جنگل میں غائب ہو گئی۔ حملہ آور جب غار میں داخل ہوئے تو انہیں جواں بخت کو حسرتناک انجام دیکھ کر از حد صدمہ ہوا۔ اس کی لاش واپس وادی میں لائی گئی۔ جہاں نہایت احترام سے اُسے سپرد خاک کیا گیا چالیس دن تک اُس کا قبیلہ سوگوار رہا۔ آخر چالیسویں کی رسوم پر جبکہ تمام قبیلہ

جمع تھا۔ نیم عریاں کاہن نے کہا۔ بھائیو میں یہ نہیں جاننا چاہتا کہ تم میں سے غدار کون ہے۔ لیکن تمہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ غدار سزا سے کبھی نہیں بچ سکتا۔ تم لوگ مقدس خون پر جواں بخت سے وفاداری کی قسم اٹھا چکے ہو۔ اور یہ کوئی معمولی چیز نہیں۔ جواں بخت کی عمر اس وقت پچاس سال کے قریب تھی۔ اس لئے پچاس کی عمر میں غدار پر اس مقدس قسم کی لعنت پڑے گی۔ اور وہ شیر کے ہاتھوں ہلاک ہو گا۔ نیم عریاں کاہن کے اس اعلان سے سب کے دل دہل گئے۔ ——— کاہن کے ان الفاظ کا مجھ پر خاص اثر ہوا۔ مگر حوصلہ کر کے دل کو برقرار رکھا۔ اور دوسرے دن اپنے ڈیرے کی طرف واپس ہوا۔ میں مجرم تھا۔ میرا سکونِ قلب رخصت ہو چکا تھا اب تجارت میں بھی میرا دل نہ لگا۔ میں تجارت چھوڑ کر اپنے وطن چلا آیا۔ چونکہ جواں بخت کی بدولت میں نے بے شمار دولت کمائی تھی۔ میں امیرانہ زندگی بسر کرتا رہا۔ لیکن میرا دل کبھی مطمئن نہ ہو سکا۔ اس نیم عریاں کاہن کے الفاظ ہمیشہ میرے کانوں میں گونجتے رہے۔ اب جس دن سے میرا پچاسواں سال شروع ہوا ہے خوف سے مجھے زندگی وبال ہو گئی ہے۔ رات کو شیروں کے دھاڑنے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ شیروں کے خوفناک سائے دیواروں پر متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ اکثر ملک الموت کے سرد پاؤں کی چاپ محسوس کرتا ہوں۔ روحیں میرے ارد گرد منڈلاتی رہتی ہیں۔ جوان بخت کی کفن پوش لاش مجھے اشارے

سے بلاتی ہے اور اسی خوف سے گوشہ نشین ہو رہا ہوں"۔ــــــــ حیدر کی داستان سن کر میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ کہ تمہیں وہم ہو گیا ہے ورنہ ایسی قسمیں کچھ حقیقت نہیں رکھتیں اور نہ تم نے جان بوجھ کر غداری کی ایسی فضول قسموں کا خیال نہ کرو۔ یہاں شہر میں شیر کہاں سے آئے گا۔ میں بہت دیر تک اُسے سمجھاتا رہا۔ بارہ بجے کے قریب میں اٹھا میرا خیال تھا۔ کہ سلیم لائبریری میں سو رہا ہو گا۔ــــــــ میں لائبریری کی طرف گیا۔ تو وہ کرسی پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگا۔ ابّا میں نے چچا کی تمام باتیں سُنی ہیں۔ وہ بہت ڈرپوک ہے۔ میں نے اُسے آہستہ سے ڈرتے ہوئے کہا۔ سلیم ایسا نہیں کہا کرتے۔ وہ شوخی سے بولا۔ وہ درحقیقت بہت ڈرپوک ہے۔ دیکھو میں نے اُسے ڈرانے کے لئے دیوار پر کیا بنایا ہے ــــــــ میں نے دیوار کی طرف دیکھا سلیم نے اس پر اپنی رنگین پنسل سے ایک بہت بڑے شیر کی تصویر بنائی تھی۔ تصویر کو دیکھ کر میں بے اختیار ہنس دیا۔ اور اُسے ساتھ لیکر باہر نکل آیا۔

(۶)

چونکہ رات کو میں دیر سے سویا تھا۔ اس لئے صبح دیر سے آنکھ کھُلی تھی۔ ابھی میں بستر میں ہی تھا کہ حیدر کی موت کی خبر پہنچی۔ اُسے رات کو کسی درندے نے ہلاک کر دیا تھا۔ میں اس وقت حیدر کے مکان پر پہنچا۔ وہاں پولیس جمع تھی۔ حیدر کی لاش بستر پر نہایت ابتر حالت میں پڑی تھی اس

کی شاہ رگ کے قریب ایک بہت بڑا گہرا زخم تھا۔ اور کسی درندے کے خون آلود پنجے بستر کی سفید چادر پر صاف نمایاں تھے ——— میں سراسیمگی سے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا لائبریری میں جا نکلا۔ اچانک مجھے سلیم کی بنائی ہوئی تصویر کا خیال آیا۔ مگر دیوار کی طرف دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔

سلیم کی بنائی ہوئی شیر کی تصویر دیوار سے غائب تھی +

ارواح خبیثہ

پالم پور

مئی ۱۹۳۸ء

میں خاندانِ سادات کا چشم و چراغ ہوں۔ میرے والدین اگرچہ غریب تھے۔ لیکن شرافت و نجابت کی وجہ سے نمایاں حیثیت رکھتے تھے میرے چچا بے اولاد تھے۔ اور مجھے بہت چاہتے تھے وہ امیر آدمی تھے انہوں نے کانگڑہ میں موضع چٹالی کے قریب ایک خوبصورت کوٹھی موسم گرما گزارنے کے لئے بنوا رکھی تھی۔ اور ہر سال گرمی کی چھٹیوں میں مجھے ہمراہ لیجایا کرتے تھے۔

چچا کی کوٹھی موضع چٹالی سے ایک میل کے فاصلے پر بالکل پہاڑ کے دامن

ہیں واقع تھی جس کے دائیں بائیں میلوں تک چائے کے خوشنما کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ پائیں باغ میں طرح طرح کے پھولوں کی کیاریاں اور پشت پر ہر ابھرا عمودی پہاڑ جا بجا شفاف پانی کے جھرنے اُس کوٹھی کو رشکِ جنّت بنا رہے تھے۔

اس عمودی پہاڑ کی چوٹی ہماری کوٹھی سے دو ڈھائی میل اونچائی پر تھی۔ جس پر ایک عظیم الشان مگر بوسیدہ قلعہ تھا جس کے ایک طرف چھوٹی سی بستی تھی۔ اس قلعے کو رِدّو کا قلعہ کہتے تھے۔ اور بستی بھی اسی نام سے موسوم تھی یہ قلعہ کسی زمانے میں زلزلے کے پُر ہول جھٹکوں سے آدھا مسمار ہو چکا تھا آدھا جو محفوظ تھا ایک پہاڑی رئیس سردار سعید احمد کی ملکیت تھا اس سردار اور میرے چچا کے آپس میں دوستانہ تعلقات تھے۔ میں کئی دفعہ چچا کے ساتھ اس پہاڑ کی چوٹی پر جا چکا تھا۔ جہاں سے نیچے...... وادی کا نظارہ اتنا دلفریب دکھائی دیتا۔ کہ طبیعت پھڑک اٹھتی۔

زمرّدیں وادی میں دور دراز تک سفید براق سی ندیوں کا جال پھیلا ہوا تھا جن کی لہریں آپس میں الوداعی بوس و کنار کرتی۔ نشیب کی طرف رواں تھیں۔ سبز درختوں پر سُرخ چونچوں والی شوخ و شنگ چڑیوں کے چہچہے مُردہ تنوں کو جان بخشنے کا دعوےٰ کرتے تھے۔

میں اس پہاڑ کی سیر کا بڑا شائق تھا۔ مگر مجھے تنہا باہر جانے کی اجازت

بہت کم ملتی تھی۔ جب کبھی چچا خود سیر کو جاتے تو مجھے ساتھ لے جاتے۔ ورنہ میں اپنے احاطے سے اس شاندار قلعے کے بام و در کو حسرت کی نگاہوں سے دیکھتا رہتا۔

سردار سعید احمد کا کنبہ مختصر تھا۔ یہ لوگ قلعے کے اس حصے میں رہتے تھے جو بستی کی طرف تھا۔ باقی تمام قلعہ خالی تھا۔ اور ہمیشہ بند رہتا تھا۔ ان بند کمروں کو درباری کمرے کہتے تھے۔

ایک دن چچی کی طبیعت ناساز تھی۔ چچا جلدی ہی زنان خانہ میں چلے گئے۔ میں بالاخانے پر اپنے کمرے کے باہر برآمدے میں بیٹھا قدرت کی خندہ روئی کی بہاریں لوٹ رہا تھا بیساکھ کی شگفتہ رات تھی۔ ماہ تاباں کی نورانی چاندنی خوشبو میں بسی ہوئی تھی برگ و بار دودھ سے دھلے ہوئے تھے۔ پہاڑ کی چوٹی پر قلعہ ریلو کے بلند کنگرے چاند کا منہ چوم رہے تھے

جوانی کا عالم تھا طبیعت میں امنگ تھی۔ اس طلسمی منظر سے میں بے اختیار ہو گیا بوڑھا حامد ابھی تک بیٹھا ان پہاڑوں کے متعلق اپنی روایات بیان کر رہا تھا مگر مجھے اس کی باتیں بار گوش معلوم ہو رہی تھیں۔ میں دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا۔ کہ کہیں یہ سوئے اور میں سیر کے لئے نکلوں۔ آخر کار وہ میری خاموشی سے اکتا کر اپنی کوٹھی میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ نیند میں خراٹے لینے لگا تو میں چپکے سے اٹھا اور کوٹ پہنا چھڑی ہاتھ میں لی اور نیچے اتر گیا۔ چاندنی رات کی اس سیر نے مجھے مسحور کر لیا۔ بارہ بجے کا عمل تھا۔ اور میں پہاڑ کی چوٹی کی طرف جا رہا تھا۔

جب میں اس شاندار قلعے کے قریب گیا تو درباری کمروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ اور اندر سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ یہ دروازے کبھی دن کو بھی نہ کھلتے تھے آج خلاف معمول رات کے بارہ بجے تک انہیں کھلا دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ میں نے قلعے کے باقی حصے کو دیکھا وہ بالکل تاریک اور سنسان تھا۔

میں فطرتاً دلیر اور نڈر تھا۔ نہ معلوم کس خیال کے زیر اثر میں بڑے

دروازے سے ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ یہ پرانی طرز کی ڈیوڑھی بہت طویل تھی جس کے پہلوؤں پر بہت سے چھوٹے چھوٹے دروازے تھے۔ مدت دراز تک بند رہنے سے اس کی ہوا متعفن ہو رہی تھی۔ میں سامنے کے بڑے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ اُس کے اندر ایک وسیع اور منقش ہال تھا جس کی چھت کے درمیان پرانے زمانے کا بہت بڑا بلوریں جھاڑ لٹک رہا تھا۔ اور اس کے ہنڈولوں میں بے شمار کافوری شمعیں روشن تھیں۔

اگرچہ یہ کمرہ اور جھاڑ گرد سے اَٹے ہوئے تھے۔ مگر اس کے باوجود جھاڑ کی بلوّریں جھالر کمرے کو بقعہ نور بنا رہی تھی اور کافور کے جلنے سے ہلکی ہلکی خوشبو پھیل کر دل و دماغ کو معطر کر رہی تھی۔

میں عالم استعجاب میں کمرے کی اس حالت اور جھاڑ کی خوشبودار روشنی پر غور کر رہا تھا۔ کہ اچانک میری نظر کمرے کے آخری حصے میں ایک سٹیج پر پڑی۔ وہاں ایک خوبصورت پلنگ پر کوئی سو رہا تھا۔ سرہانے کھونٹی کے ساتھ زرہ بکتر اور دوسرے ہتھیار لٹک رہے تھے۔ میری حیرت میں مزید اضافہ ہوا جو کچھ میں دیکھ رہا تھا۔ کم از کم ایک صدی پہلے کے رسم و رواج کے مطابق تھا۔

اتنے میں کمرے کا آخری دروازہ کھلا اور ایک نہایت خوبصورت لڑکی زربفت کا چست لباس پہنے ہوئے نمودار ہوئی۔ یہ لڑکی کیا تھی گویا

کوہ قاف کی پری تھی جسے پر کاٹ کر چھوڑ دیا گیا ہو۔ اُس کا آفتابی چہرہ بڑی بڑی ہگوں آنکھیں اور محراب دار ابرو قدرت کا شاہکار تھے اُس کے گلاب کی پنکھڑیوں جیسے نرم و نازک لبوں پر حقارت آمیز تبسم کھیل رہا تھا۔ اس لڑکی کا سحر کار حسن دیکھ کر میرا دل دھڑکنے لگا۔

وہ پلنگ کے قریب گئی۔ سوئے ہوئے شخص کو جھک کر دیکھا۔ وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ معاً اُس نے اپنی کمر سے ایک چمکتا ہوا خنجر نکالا اور اُس شخص کے سینے میں گھونپ دیا۔ بدنصیب مقتول کے زخم سے خون کا فوارہ پھوٹ نکلا اور تمام بستر خون آلود ہو گیا۔

قاتلہ سٹیج سے اتری اور ہال کمرہ سے گزر کر باہر جانے لگی وہ بالکل میرے قریب سے گزرنے والی تھی۔ اُسے اس طرح بھاگتے دیکھ کر میں اُسے پکڑنے کے لئے بڑھا۔ مگر مجھے دیکھ کر اس نے خود ہی میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے ڈیوڑھی سے باہر لے آئی۔ پھر مجھے ساتھ لیکر دوڑنے لگی۔ اُس کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ میں بالکل بے بس ہو گیا۔

وہ اس قدر تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ گویا ہوا کے دوش پر سوار ہے۔ میں بمشکل اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ دفعتہً پیچھے سے گھوڑوں کے ٹاپوؤں کی آواز آنے لگی۔ کچھ آدمی ہمارے تعاقب میں آ رہے تھے۔ اس بلائے ناگہانی سے میرے رہے سہے حواس گم ہو گئے۔ میں اپنے آپ کو قاتل سمجھنے

لگا۔ پھانسی کا تختہ میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ اور لوگوں کی پھٹکار کانوں میں گونجنے لگی۔

اس خطرے سے آگاہ ہو کر لڑکی نے اپنی رفتار اور تیز کر دی وہ مجھے بگولے کی طرح اڑائے لئے جا رہی تھی۔ گلاب کی خاردار جھاڑیوں سے میرے کپڑے پھٹ گئے۔ گھٹنے اور پنڈلیاں زخمی ہو گئیں آخر وہ ایک خطرناک کھڈ کے دہانے پر رکی ان سواروں کو دیکھ کر (جو اب قریب پہنچ چکے تھے) اُس نے ایک قہقہہ لگایا۔ اور میرے سمیت کھڈ میں کود گئی۔

(۲)

میری آنکھ کھلی تو میں اپنے کمرے میں پلنگ پر دراز تھا۔ میرے سر اور دیگر اعضا پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ چچا اور چچی میرے پاس بیٹھے تھے میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر میرا بند بند درد کر رہا تھا۔ چچی بولی "بیٹا! چپ چاپ لیٹے رہو۔ ڈاکٹر نے ہلنے جلنے سے منع کر دیا ہے۔"

میں نے کراہتے ہوئے کہا "مجھے کیا ہو گیا ہے"۔ چچی کہنے لگی "پرسوں علی الصبح گھر سے تمہیں غائب پا کر ہم نے تمہاری تلاش کی۔ دوپہر تک تمہارا کچھ پتہ نہ چلا۔ آخر ایک گوالے نے ہمیں اطلاع دی کہ فلاں کھڈ میں ایک لاش درختوں سے الجھی ہوئی پڑی ہے۔ تمہارے چچا فوراً کئی آدمیوں کو لیکر وہاں پہنچے اور بڑی مشکل سے تمہیں کھڈ سے نکلوایا۔ اُس وقت تم

بالکل مردہ تھے۔ لیکن تمہارے چچا کے تار دینے پر پالم پور سے جو ڈاکٹر وقت پر پہنچ گیا تھا۔ اُس نے ہمیں تسلّی دی۔ ورنہ ہم تمہارے والد کو تار دینے والے تھے۔ خدا کا شکر ہے۔ کہ تمہاری جان بچ گئی۔ اگرچہ تمہارا جسم زخموں سے بھرپور ہے۔ مگر ڈاکٹر کہتا ہے کہ وہ زیادہ گہرے نہیں جلدی اچھے ہو جائیں گے۔"

چچی کے بیان پر اس پرانے قلعے کی سب باتیں یکے بعد دیگرے مجھے یاد آگئیں۔ میں نے جھرجھری لیکر پوچھا "اس لڑکی کا کیا حشر ہُوا؟" چچی نے کہا "کونسی لڑکی؟" میں نے جواب دیا "وہی فائلہ۔ جو میرے ساتھ کودی تھی؟" چچی دہشت زدہ ہو کر بولی "تم تو تنہا تھے۔ لڑکی وغیرہ کا ہمیں کچھ پتہ نہیں" میں نے کانپتے ہوئے کہا "تو کیا فائلہ فرار ہو گئی ہے؟"

چچا جھلا کر بولے "بیگم خدا کے لئے چپ رہو۔ شاید اس کا بخار تیز ہے اور ہذیان بک رہا ہے۔ ڈاکٹر نے زیادہ باتوں سے منع کیا ہے" چچی خاموش ہو گئی۔ میں سوچنے لگا "کیا سچ مچ میں ہذیان بک رہا ہوں۔ اور جو کچھ اس رات پرانے قلعہ میں دیکھ چکا ہوں ایک واہمہ ہے؟"

میرا علاج اور تیمارداری خاص طور پر ہوئی ہیں ایک ماہ کے اندر بالکل صحت یاب ہو گیا۔ مگر اُس رات والا واقعہ مجھے ہرگز نہ بھولا۔ میں نے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ چچا سے اس کے متعلق کہوں لیکن جرأت نہ ہوئی کیونکہ اُسی رات چوری چھپے باہر جانے کی وجہ سے وہ مجھ پر سخت ناراض تھے اور

میرے والدین سے میری شکایت کرنا چاہتے تھے۔ جس سے نیک دل چچی نے بمشکل کہہ سنکر انہیں روکا تھا۔

اس واقعہ کو چار پانچ سال گذر گئے۔ میں تعلیم سے فارغ ہو گیا گھر میں میری شادی کے تذکرے ہونے لگے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں چچا کی کوشش سے میری منگنی رلو کے سردار کی اکلوتی لڑکی فاخرہ سے ہو گئی۔ سعید احمد بہت دولت مند تھے انہوں نے یہ رشتہ صرف ہمارے خاندانی اعزاز اور میری اعلےٰ تعلیم کی وجہ سے منظور کیا۔ ورنہ آبا کی مالی حالت اس قابل نہ تھی کہ ایسی جگہ میرا رشتہ ہو جاتا۔

میرے والدین اس رشتے پر بہت نازاں تھے۔ چچی تو فاخرہ پر اس قدر فدا تھی کہ دن رات اس کی صورت و سیرت کے گن گایا کرتی۔ میں اپنی کامیابی پر صرف مسرور ہی نہ تھا۔ بلکہ فاخرہ کا نادیدہ عاشق ہو رہا تھا منگنی کے دو سال بعد میری شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ جب رخصتی کے بعد ہم لوگ گھر پہنچے۔ تو میں اُسے کار سے اتار کر اندر لایا اُسکے معطر جسم کے اس سے میری رگوں میں ایک برقی لہر دوڑ گئی۔ وہ چنبیلی کی شاخ کی طرح نازک تھی اُسکا بدن مخمل کی طرح نرم تھا۔ وہ مسندِ عروسی پر بٹھا دی گئی اور مستورات نے اُسے اپنے جھرمٹ میں لے لیا۔

مَیں اشتیاقِ دیدار میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ تمام دن میں نے گھڑیاں گن

کرمکاٹا۔ رات کو جب دلہن کے کمرے میں گیا۔ تو وہ سر جھکائے صوفے پر بیٹھی تھی۔ میں نے دروازہ میں قدم رکھا۔ تو اس نے آہٹ پاکر سر اٹھایا۔ اور مجھے دیکھ کر لجالو کے پودے کی طرح سمٹ گئی۔

پہلے تو مجھے اپنی آنکھوں پر دھوکا ہوا۔ مگر جب آگے بڑھکر میں نے غور سے دیکھا تو میرے چھکے چھوٹ گئے۔ دہشت سے میرا بدن لرزنے لگا۔ آہ جس فاخرہ کی مجھے آرزو تھی۔ وہ کہیں دکھائی نہ دی۔ بلکہ اُس کی بجائے وہ قاتلہ صوفے پر بیٹھی تھی جو اُس رات مجھے کھڈ میں لے کُودی تھی۔ ——————

میں الٹے پاؤں واپس چلا آیا۔ اور مردانے میں بیٹھکر اپنی آئندہ زندگی پر غور کرنے لگا۔ افسوس قدرت نے مجھے ایک قاتلہ سے وابستہ کر دیا تھا۔ جو اپنے آشنا کو میرے سامنے موت کے گھاٹ اُتار چکی تھی۔ کیا میں ایک آبرو باختہ خونی عورت سے وفاداری کی اُمید رکھ سکتا ہوں؟ شاید ایک دن میرا بھی وہی حشر ہو۔ جو سیج پر سوئے ہوئے شخص کا ہوا............

.... آخر انتہائی سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا۔ کہ تمام عمر اس قاتلہ سے کوئی تعلق نہیں رکھونگا۔ میں اپنے فیصلے پر سختی سے کاربند رہا۔ اگرچہ گھر والوں کے سامنے اس سے اظہارِ نفرت نہ کر سکتا۔ لیکن تنہائی میں کبھی اس کے قریب بھی نہ پھٹکار مجھے خوف تھا کہ کہیں اس کا پتھر کو موم کرنے والا حسن مجھے اسیرِ دام نہ بنا

دے۔ تاہم گھر میں کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ کہ میں اس سے نفرت کرتا ہوں بلکہ وہ ہر ایک سے میرے حُسن سلوک کی تعریف کرتی۔ اس دانشمندانہ طریقے سے وہ میرے دِل پر قابو پانا چاہتی تھی۔ مگر میں بہت محتاط تھا۔

اسکی ہر بات میں کشش تھی چند ہی دنوں میں وہ اتنی ہر دلعزیز ہو گئی کہ سارا گھر اُس کا کلمہ پڑھنے لگا۔

(۳)

میری شادی کو عرصہ گزر چکا تھا۔ ایک دن والدہ برادری میں کہیں گئی ہوئی تھی۔ گھر میں اکیلی فاخرہ ہی تھی گرمی کی دوپہر تھی۔ دھرتی انگارے اگل رہی تھی۔ ہر بُنِ مو سے پسینہ جاری تھا۔ آج صبح مجھے بخار کی حرارت تھی۔ مگر فاخرہ کے خوف سے اندر نہ گیا۔ اور باہر مردانے میں پلنگ پر لیٹ رہا۔ مجھے نیند آنے لگی۔

میری آنکھ جھپکی ہی تھی کہ نہایت آہستگی سے دروازہ کھلا۔ فاخرہ دبے پاؤں کمرے میں آئی اور بستر پر جھک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں خوفزدہ ہو کر اٹھ بیٹھا۔ اُس رات والا خوفناک خنجر میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ میں نے گھبرا کر کہا "کیوں کیا آج مجھ پر ہاتھ صاف کرنے آئی ہو" وہ ہکلاتے ہوئے بولی "خدا نہ کرے۔ آپ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ میں تو آپ کو دوائی دینے آئی ہوں میں نے کہا" خدا کے لئے تم چلی جاؤ۔ میں خود ہی دوائی پی لونگا۔ تمہیں

دیکھ کر مجھے الجھن ہوتی ہے"۔

میرے منہ سے یہ تلخ فقرے سُنکر وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔ آخر آپ کو مجھ سے اتنی نفرت کیوں ہے؟" میں نے کہا۔ "قاتلہ سے کون محبت کر سکتا ہے"؟ وہ حیران ہو کر بولی" آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں نے برافروختہ ہو کر جواب دیا۔ "تم اپنے حسن اور چرب زبانی سے مجھے مسخر نہیں کر سکتیں۔ تمہاری سزا صرف نفرت و حقارت ہی نہیں بلکہ پھانسی کا تختہ ہے۔ میں اپنی آنکھوں سے تمہیں جرم کا ارتکاب کرتے دیکھ چکا ہوں۔ اب تم کسی صورت بھی انکار نہیں کر سکتیں"۔ یہ کہتے ہوئے میں نے اُسے وہ واقعہ یاد دلایا۔ جو اُس رات میں رتو کے قلعے میں دیکھ چکا تھا۔

میری باتیں سُنکر اس کا رنگ متغیر ہوتا گیا اور وہ غش کھا کر گر گئی۔ اگرچہ مجھے اس کے مجرم ہونے کا مزید ثبوت مل گیا۔ مگر گھر والوں کے ڈر سے اُسے بے ہوشی کی حالت میں اندر لے جانا پڑا اور بستر پر لٹا کر اُس کے ہاتھ جو برف کی طرح سرد ہو رہے تھے۔ اپنے ہاتھوں میں لیکر گرم کرنے لگا۔ اسکے ہاتھ ایسے نرم تھے جیسے ریشم کے لچھے اُس کے اور قاتلہ کے ہاتھوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ جتنے وہ سخت تھے اُتنے ہی یہ ملائم میں سوچنے لگا۔ کیا ان نازک انگلیوں کی گرفت اتنی مضبوط ہو سکتی ہے۔ کہ میرے جیسا طاقتور آدمی مغلوب ہو جائے۔ اس خیال سے مجھے اپنی غلطی

کا احساس ہؤا۔ اور اپنے نا واجب سلوک پر پشیمانی ہونے لگی۔ میں نے بے اختیار اُس کے مرمریں ہاتھوں کو چوم لیا۔ مگر جب میری نظر اسکے چہرے پر پڑی نفرت کے جذبات پھر بیدار ہو گئے۔ اور میں اپنی کمزوری پر ہنستا ہؤا باہر نکل گیا۔

اُس دن سے وہ سخت بیمار ہو گئی۔ اُسے بے ہوشی کے دورے پڑنے لگے اُسکے والدین اُسے اپنے گھر لے گئے۔ جہاں کچھ عرصہ بعد وہ صحت یاب ہو گئی۔ لیکن اُسی اثنا میں اسکا والد فوت ہو گیا اور وہ اپنی ماں کی تنہائی کا عذر کر کے اپنے میکے میں رہنے لگی۔

اس بات کو کئی سال گذر گئے ایک دفعہ میں سخت بیمار ہو گیا میری زندگی کی اُمید جاتی رہی۔ ابّا جان کی اطلاع پر وہ فوراً چلی آئی اور میری تیمارداری میں بڑے خلوص اور تندہی سے حصّہ لینے لگی۔ میری حالت دن بدن خراب ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر کی رائے تھی کہ میرے جسم میں ایک سیر تازہ خون پہنچانے سے میری جان بچ سکتی ہے۔ جس پر فاخرہ نے اپنا خون پیش کیا۔

فاخرہ کی اس قربانی پر میں دنگ رہ گیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایسی ظالم اور سنگ دل عورتیں اپنی فطرت کو اس قدر بدل سکتی ہیں وہی عورت جو کبھی خون آشام درندہ معلوم ہوتی تھی۔ اب دیوی کے روپ میں جلوہ گر تھی۔ میں اپنے گذشتہ سلوک پر شرمسار تھا۔ وہ قاتلہ ہی سہی مگر میرے لئے تو

فرشتہ رحمت تھی۔ اگر وہ کسی کی جان لینا جانتی تھی تو جان بچانے کا جذبہ بھی اس میں موجود تھا اس بڑھے ہوئے ایثار سے اُس نے میرا دل جیت لیا۔

خون کے امتحان کے بعد اُس کا خون میرے جسم میں پہنچایا گیا جس سے میری حالت سنبھل گئی۔ لیکن والدہ کی زبانی معلوم ہوا کہ زیادہ خون نکل جانے سے وہ نڈھال ہو رہی ہے۔ میں روز بروز صحت یاب ہونے لگا۔ اور اس کی حالت ابتر ہوتی گئی۔ میں اکثر اس کی بیمار پرسی کو جاتا اور پہروں اسکے پاس بیٹھ کر اسکا دل بہلاتا۔

اس ہم نشینی سے مجھے اسکے حسن وجمال کے مطالعہ کا کافی موقعہ ملا اور میں اس کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو گیا۔ حسن بیمار ہو کر زیادہ دلکش ہو جاتا ہے وہ بستر پر پڑی ہوئی برف کی حسین مورتی تھی۔ اگرچہ اسکے چہرے پر خون کی چھینٹ تک نہ تھی۔ مگر جب میرے الفاظ اسکے کانوں تک پہنچتے تو اس کا چہرہ پھول کی طرح کھل جاتا وہ اتنی خوش ہوتی جیسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔

میں اس وفا کی پتلی کو پھر تندرست دیکھنا چاہتا تھا۔ اُسکے علاج میں میں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ اُسکی تیمارداری میں اپنا خواب وخور حرام کر دیا۔ مگر بے سود۔ رفتہ رفتہ اس کی بیماری دِق میں تبدیل ہو گئی اور وہ چھ مہینے کے اندر گھل کر کانٹا ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔

فاخرہ رتو جانے کی متمنی تھی۔ اس کی والدہ کی بھی یہی خواہش تھی اس لئے میں اُسے رتو لے گیا۔ جہاں اس کی حالت خراب ہو گئی۔ رات کا وقت تھا۔ میں اس کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ وہ خلاف معمول کچھ سوچ رہی تھی۔ میں نے اُسے متفکر دیکھ کر کہا: "فاخرہ آج تم اتنی غمگین کیوں ہو۔ کوئی فکر نہ کرو۔ تمہاری حالت پہلے سے بہتر ہے۔" وہ بولی: "میں موت سے بالکل نہیں ڈرتی البتہ ایک عرصہ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں جس کی آج تک مجھے جرأت نہ ہو سکی۔" میں نے کہا: "وہ کون سی ایسی اہم بات ہے جس نے تمہیں تذبذب میں ڈال رکھا ہے۔"

تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد وہ کہنے لگی: "آپ کو یاد ہو گا۔ آپ نے ایک دفعہ مجھے قاتلہ کہا تھا۔" میں نے ندامت سے جواب دیا: "یہ ناگوار ذکر نہ چھیڑو مجھے معاف کر دو۔ میں سخت شرمندہ ہوں۔" وہ بولی: "میرے نیک دل شوہر میں آپ کی ہمدردی کی قدر اور محبت کا احترام کرتی ہوں۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں لیکن جس غلط فہمی میں آپ مبتلا ہیں اُسے دور کرنا میں اپنا فرض سمجھتی ہوں۔"

اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں بچپن میں بہت شریر تھی لکھنا پڑھنا مجھے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ دن رات کھیل کود میں مشغول رہتی میری انا کی لڑکی رحمانہ جو مجھ سے چار سال بڑی تھی۔ شوخی و شرارت میں مجھ

سے بھی بڑھ چڑھ کر تھی۔ ہم دونوں میں بہت محبت تھی۔ رحمانیہ میری دن رات کی ہم جلیس تھی۔ ہم دونوں دن بھر کھیلنے کے علاوہ اکثر چاندنی راتوں کو بھی جب گھر کے لوگ سو جاتے چوری چھپے اس قلعے کے تاریک اور سنسان کمروں میں آنکھ مچولی کھیلا کرتیں۔ اسی طرح دن گذرتے گئے حتیٰ کہ ہم دونوں جوان ہو گئیں۔ اب میری عمر چودہ سال اور رحمانیہ کی اٹھارہ سال تھی۔ مگر ہمارے الھڑپنے میں فرق نہ آیا۔"

"انہی ایام میں ایک رات جبکہ چاند قلعے کے گوشے گوشے کو منوّر کر رہا تھا اور گھر خواب نوشیں کے مزے لے رہا تھا۔ ہم دونوں اپنے کمرے سے نکل کر آنکھ مچولی کھیلنے لگیں۔ اور اسی شغل میں ہم درباری کمرہ کی طرف جا نکلیں جو ہماری رہائش سے بہت دُور تھے۔ یہاں رحمانیہ کہیں چھپ گئی اور میں اس کی تلاش کرتی ہوئی اس گیلری پر جا چڑھی۔ جسکے نیچے درباری ہال تھا۔"

"یکایک جھاڑ روشن ہو گیا اور کمرہ خوشبو سے مہک اٹھا۔ آہ! اوائل عمر کی بے پروائی بھی کیا شے ہوتی ہے مجھے رحمانیہ کی تلاش کے سوا دوسرا خیال ہی نہ تھا۔ میں اس روشنی کو بھی رحمانیہ کی شرارت سمجھی اور خیال کیا کہ رحمانیہ اسی کمرے میں چھپی ہو گی۔ کیونکہ ہال کمرے میں سٹیج پر جو پلنگ بچھا تھا اس پر کوئی سو رہا تھا۔ میں نے دل میں کہا۔ اب رحمانیہ کہیں نہیں جا سکتی۔

"جیسے ہی میں نے نیچے اترنے کے لئے زینے پر قدم رکھا۔ تو ہال کی آخری دیوار میں ایک دروازہ کھلا اور ایک لڑکی اندر آگئی۔ یہ لڑکی بالکل میری ہمشکل تھی جسے دیکھ کر خوف سے میں چھپی دروازے کی اوٹ میں ہو گئی لڑکی نے سوئے ہوئے شخص کو دیکھا اور خنجر سے اُسے ہلاک کر کے خود ڈیوڑھی کی طرف بھاگ گئی۔ سو دروازے پر ایک لبادہ پوش کھڑا تھا جس نے بڑھ کر اُسے پکڑ لیا اور دونوں باہر نکل گئے۔"

اتنے میں مجھے فاخرہ! فاخرہ کی آواز سنائی دی یہ رحمانیہ تھی جو میرے دھوکے میں اس لڑکی کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ ادھر خوف سے میری زبان تالو سے لگ رہی تھی۔ میں اُسے اپنی موجودگی سے آگاہ نہ کر سکی۔ یکایک ایک اور لبادہ پوش دروازے کے سامنے آیا۔ اور اس نے رحمانیہ کو پکڑ لیا اس شخص کے خوفناک چہرے کی تھوڑی سی جھلک مجھے دکھائی دی۔ اور خوف و ہراس سے مجھے غش آگیا۔"

"صبح گھر والوں نے مجھے بیہوشی کی حالت میں درباری ہال کے زینے پر سے اٹھایا۔ اس صدمے سے کئی دن تک میری حالت خراب رہی ایک دن میں نے رحمانیہ کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا وہ گم ہو گئی ہے اور باوجود انتہائی تلاش کے اسکا سُراغ نہیں مل سکا۔ سب کا خیال تھا کہ وہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔"

رحمانیہ پر اس قسم کا الزام میں گوارا نہ کر سکی۔ میں نے ابّا جان کو بلا کر اس رات کا سب واقعہ سنایا۔ وہ نہایت افسوس سے کہنے لگے۔ آہ، اب رحمانیہ کی تلاش بے سود ہے ارواحِ خبیثہ کے ہاتھوں ہلاک ہو گئی۔ اُس کی لاش کسی کھڈ میں جنگلی جانوروں کی غذا بن چکی ہو گی ...... میرے اصرار پر انہوں نے بتایا کہ اُنکے پر دادا کی ایک لڑکی تھی۔ جس کے حسن کی علاقہ بھر میں دھوم تھی۔ بڑے بڑے رئیس اور سردار اُس سے شادی کرنیکے خواہاں تھے۔ مگر اس لڑکی کو ایک غریب سپاہی سے محبت تھی۔ اس لئے وہ کسی سے بھی شادی پر رضامند نہ ہوئی۔ .... ابتدا میں تو کسی کو اس کی محبت کا علم نہ ہوا۔ لیکن رفتہ رفتہ محبت کے چرچے ہونے لگے۔ جب اس کے باپ تک یہ باتیں پہنچیں۔ تو اسکی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے طیش میں آکر اُس سپاہی کو جلاوطن کر دیا اور اس لڑکی کی شادی ایک سردار سے کر دی یہ سردار اس لڑکی کا شیدا تھا۔ مگر لڑکی اپنے غریب عاشق کو نہ بھلا سکی اور خفیہ خفیہ اس کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گئی۔ .... سردار کو اس لڑکی کی پہلی محبت کا علم تھا۔ اس لئے وہ اس کی سخت نگرانی کرتا۔ اور لڑکی کو اپنے عاشق سے ملنے کا موقعہ تو مل نہ سکا۔ تاہم اس نے اپنی محرم راز کنیز کے ذریعے اس سے سلسلہ پیغام جاری رکھا۔ ایک دن لڑکی نے اپنے عاشق کو کہلا بھیجا۔ کہ وہ آج اپنے باپ

کے گھر جانے والی ہے اور آدھی رات کو درباری ہال کی ڈیوڑھی پر اُسکا انتظار کرے گی۔ اس سازش کے بعد وہ اپنے باپ کے گھر آئی اسکا شوہر اسکے ہمراہ تھا۔ رات کو وقت مقررہ پر جب وہ اپنے .... عاشق سے ملنے کے لئے درباری ہال میں آئی تو اُسکا شوہر سٹیج پر سو رہا تھا۔ شوہر کو خواب میں مدہوش پا کر ایک شیطانی جذبہ کے ماتحت اُسے ہلاک کر دیا۔ اور خود اپنے عاشق کے ساتھ جو ڈیوڑھی میں اس کا منتظر تھا بھاگ گئی۔ نہ جانے کس طرح اُس لڑکی کے باپ کو اس حادثے کی خبر ہو گئی اُس نے چند فوجی جوان اس لڑکی کی تلاش میں بھیجے۔ چنانچہ وہ لڑکی ان سواروں کے تعاقب سے تنگ آ کر اپنے عاشق سمیت ایک گہری کھڈ میں کود کر مر گئی اس واقعہ کو ایک صدی کے قریب عرصہ گزر چکا ہے مگر آج تک ہر سال اُس تاریخ پر درباری کمرے میں یہ آوارہ روحیں اس خونیں ڈرامے کو دہراتی ہیں۔"

یہ کہکر فاخرہ نے ایک لمبا سا سانس لیا۔ اور حسرت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ کر کہا۔" اس ہولناک رات کے واقعہ سے مجھے اتنا صدمہ ہؤا کہ میری شگفتگی اور زندہ دلی یک دم کافور ہو گئی۔ میں بالکل سنجیدہ اور متین بن گئی۔ آہ غالباً یہ وہی رات تھی جس رات اُس لڑکی کی رُوح نے آپ کو اپنے عاشق کی رُوح سمجھ کر کھڈ میں گرایا۔"

اس عجیب و غریب انکشاف پر میں نے سر پیٹ کر کہا۔ "آہ فاخرہ۔ یہ بات تم نے مجھے اُسی دن کیوں نہ بتادی"۔ وہ گلوگیر آواز سے کہنے لگی۔ "یہ میری بدقسمتی تھی۔ خلافِ توقع آپ کی زبانی اُس خوفناک واقعہ کا ذکر سُنکر اُس رات والا سین میری آنکھوں کے سامنے آگیا۔ اس کے بعد صفائی کی گنجائش ہی نہ تھی میرا ایسے موقعہ پر بے ہوش ہونا اعترافِ جرم کے مترادف تھا۔ اور اب چونکہ چند لمحوں کی مہمان ہوں۔ اس لئے یہ واقعہ آپ کے گوش گزار کرنا ضروری سمجھا"۔

یہ کہتے ہوئے اس کا سانس اکھڑ گیا۔ اور چہرے پر موت کی زردی چھانے لگی۔ چند لمحوں میں اسکی روح عالمِ بالا کو پرواز کر گئی۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ آہ کسے بھی اس کے اتنی جلدی مرنے کی توقع نہ تھی۔ اس نورانی شمع کے یکلخت بجھ جانے سے دنیا مجھے اندھیر دکھائی دینے لگی۔ آتشِ غم نے میرے تن بدن کو پھونک دیا۔ میں نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور قلعے سے باہر نکلکر سنگلاخ زمین پر تڑپ تڑپ کر دھاڑیں مارنے لگا۔

موسمِ بہار کی رنگینیاں اور سرسبز پہاڑ کی دلکشی میری نظروں ہیچ تھی۔ بیساکھ کی جادو بھری رات آنکھوں میں خار کی طرح کھٹک رہی تھی۔ جگمگاتے ہوئے چاند کی زریں کرنیں زہر آلود برچھی کی طرح میرے دل میں تیر رہی تھیں موسمی ہوا کے مخمور جھونکے میرے زخموں پر نمک پاشی کر رہے تھے۔ فضا سوگوار

اور کائنات ماتم کدہ معلوم ہوتی تھی۔

میں عالمِ اضطراب میں آنسو بہاتا قلعے کے ویران حصّے کی طرف جا نکلا۔ آہ! آج پھر درباری کمرہ کے دروازے کھلے تھے۔ اندر روشنی ہو رہی تھی۔ میں دانت پیستا ڈیوڑھی کی طرف بڑھا۔ یکایک وہ طلسمی حسینہ اپنے لبادہ پوش عاشق کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوا کی طرح میرے قریب سے گزری۔

میں بھوکے شیر کی طرح اُن کی طرف لپکا۔ لیکن وہ پُراسرار جوڑا آناً فاناً میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ فاخرہ سچی تھی۔ آہ! اس منحوس جوڑے کی بدولت میں نے اپنی فرشتہ سیرت بیوی کی زندگی تلخ کی ×

پاداش عمل

رہنماس

۲۵ر دسمبر ۱۹۳۰ء

کئی روز سے میں یہ خواب بلاناغہ دیکھ رہی تھی ہرچند خیالات اس طرف سے ہٹانا چاہتی۔ مگر دل نہ مانتا۔ وہ اپنی ہٹ پر تلا ہوا تھا۔ کہ مشیت کو ضرور کچھ نہ کچھ منظور ہے دسمبر کا مہینہ تھا۔ کڑکڑاتی سردی پڑ رہی تھی۔ میں آتشدان کے قریب اپنے بستر میں بیٹھی اسی ادھیڑبن میں تھی۔ میرا دل بہت اداس ہو رہا تھا۔ خواب والے تحکمانہ الفاظ "جلدی رہنما سے جا" میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ یہ خواب اپنی نوعیت کے

لحاظ سے بالکل نرالا تھا مصیبت یہ کہ کسی کے سامنے بیان بھی نہ کر سکتی تھی۔ مبادا کوئی دیوانہ سمجھے۔ بالآخر اس نتیجہ پر پہنچی کہ مجھے رہتاس ضرور جانا چاہیئے۔

قلعۂ رہتاس جہلم سے آٹھ نو کوس کے فاصلہ پر ایک خطرناک برساتی نالہ کے پار واقعہ ہے جس کا پاٹ کئی میل چوڑا ہے۔ یہ نالہ جس کو گھان کہتے ہیں۔ برسات کے دنوں میں قہر خدا بن جاتا ہے۔ اونٹ۔ گھوڑا انسان جو بھی اس کی زد میں آجائے بہا لے جاتا ہے۔ قلعۂ رہتاس کو بڑے بڑے دیو ہیکل پہاڑ اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہیں۔ یہ دنیا سے الگ تھلگ بستی ہے۔ دوپہر کے وقت ہمارا مختصر قافلہ گھان کے کنارے پہنچ گیا۔ یہ قافلہ صرف چار آدمیوں پر مشتمل تھا جن میں ایک تو میں خود تھی۔ دوسری میری والدہ محترمہ۔ تیسری میری منہ بولی بہن رضیہ اور چوتھا میرا ملازم غازی تھا۔ چونکہ گھوڑے بکثرت کرایہ پر مل جاتے ہیں۔ اس لئے فوراً ہی سواری کا انتظام ہو گیا چنانچہ ڈیڑھ گھنٹہ تک ہم لوگوں نے گھان کو عبور کر لیا۔ اور چکر دار پہاڑی راستہ طے کرتے ہوئے خواص خوانی دروازہ سے قلعہ رہتاس میں داخل ہوئے۔ قلعہ کے شاندار دروازے مستحکم فصیل پائیدار دمدمے اور عجیب غریب عمارات دیکھ کر بانی قلعہ کی عظمت کا دبدبہ دلوں میں

بیٹھ جاتا ہے۔ یہ قلعہ جو کئی مربع میل زمین گھیرے ہوئے ہے۔ شیر شاہ سوری نے بنوایا تھا۔ خوبصورت عمارات اب کھنڈرات کی شکل میں تبدیل ہو چکی ہیں لیکن باہر سے دیکھنے پر یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ ابھی معمار اس قلعہ کو مکمل کر کے گئے ہیں۔

قلعہ کے نصف حصّہ میں ایک پُر رونق قصبہ آباد ہے۔ اور نصف حصّہ بالکل غیر آباد اور سنسان پڑا ہے۔ جہاں دن دہاڑے گزرتے بھی خوف آتا ہے بہت سے مافوق الفطرت قصّے اس قلعہ سے منسوب ہیں جب ہم لوگ منزلِ مقصود پر پہنچے۔ دن ڈھل چکا تھا۔ سوہل دروازے پر ڈاک بنگلے میں رہائش کا بندوبست کیا گیا۔

سوہل دروازہ جو خوبصورتی اور پائداری کے لحاظ سے روہتاس کی سب عمارات میں ممتاز ہے مگر بالکل غیر آباد حصّے میں واقع ہے۔ اسکی اوپر والی منزل سے اب ڈاک بنگلے کا کام لیا جاتا ہے۔ ایک بوڑھے باادب چوکیدار نے بڑے تپاک سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ گھوڑوں کی سواری سے کافی تھکاوٹ ہو چکی تھی۔ سیر کا موقع نہ ملا۔

دوسرے دن صبح سویرے ہی میں اور رضیہ چائے سے فارغ ہو کر سیر کے واسطے تیار ہو گئیں۔ والدہ محترمہ اس وقت تلاوتِ قرآن میں مشغول تھیں۔ اس لئے ہم نے سوچا کہ ہم دونوں جلد ہی سیر کے واسطے

نکل جائیں۔ تاکہ والدہ محترمہ ساتھ نہ جا سکیں۔ کیونکہ ایک تو بڑے بوڑھوں کا ساتھ ہی نہایت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ دوسرے میں چاہتی تھی۔ کہ کسی ویرانے میں جہاں کوئی مخل نہ ہو۔ اچھی طرح قدرت کا نظارہ کروں چنانچہ میں نے چوکیدار سے دریافت کیا کہ اندھیری بُرج کس جگہ واقعہ ہے۔ اور یہاں سے کتنی دور ہے۔ چوکیدار نے جواب دیا مسفید عمارت جو سامنے دکھائی دیتی ہے۔ وہی اندھیری بُرج ہے مگر راستہ ناہموار اور دور ہے البتہ ادھر سے ایک نہایت صاف اور آرام دہ راستہ فصیل کے اوپر سے جاتا ہے۔ جس کے ذریعہ آپ آسانی سے وہاں پہنچ جائیں گی۔ مگر وہ راستہ ہے بڑا سنسان۔ کبھی کبھی انگریز سیاح جو یہاں مقیم ہوتے ہیں۔ اس راستہ سے وہاں جاتے ہیں۔ اگر حکم ہو تو میں بھی آپ کے ساتھ چلوں"۔

میں "نہیں، تمہاری کچھ ضرورت نہیں۔ راستہ سنسان ہے تو کیا ہُوا۔ ہم بھی تو دو ہیں"۔

چوکیدار "حضور اندھیری بُرج بڑا خطرناک ہے۔ وہاں اکیلے دوکے کا کام نہیں۔ وہاں تو چڑیلوں کا مسکن کہا جاتا ہے"۔

رضیہ "چڑیلیں ہم سے کیا کہیں گی۔ اُن سے تو ہمارا اپناپا ہے"۔

چوکیدار خاموش ہو گیا۔ اور تعجب خیز نگاہوں سے دیکھ کر ہمارے

آگے ہو لیا اور چوبدار دروازہ کھول کر ایک طرف ہٹ گیا

(۳)

نیلگوں آسمان پر سورج بڑی آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ ہوا یادِ رفتگاں میں سرد آہیں بھرتی ہوئی خاردار جھاڑیوں میں سے گزرتی تو ایسی درد انگیز صدا نکلتی جیسے کوئی دکھیا ماں ارمانِ محبوب پر نوحہ کر رہی ہے کھنڈرات زبانِ حال سے پکار پکار کر دنیا کی بے ثباتی کا اظہار کر رہے تھے۔ راستہ واقعی مہیب تھا۔ جا بجا ٹوٹے ہوئے زینے اور برجیاں مکڑی کے جالوں سے لپٹی ہوئی تھیں۔ جگہ جگہ جنگلی پرندوں کے گھونسلے تھے۔ جب وہ ہمارے پیروں کی آہٹ سن کر پروں کو پھڑپھڑاتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ غولِ بیابانی تالیاں بجا رہے ہیں۔ ہم دونوں تیز رفتاری سے چلنے لگیں۔ خدا خدا کر کے راستہ ختم ہوا۔ اور اندھیرے برج میں پہنچیں نام تو اندھیری برج ہے۔ مگر اندھیرے کا نام و نشان تک نہیں۔ یہاں آ کر ہماری وحشت دور ہو گئی۔ سنسان تو یہ بھی تھا مگر کبھی کبھی چرواہے اپنی بکریوں کے پیچھے اونچے سروں میں الاپتے ہوئے نیچے سے گزر جاتے۔ ہم دونوں دریچوں میں بیٹھ گئیں یہاں سے نہایت دلفریب مناظر دکھائی دیتے تھے۔ ایک طرف میلوں لمبا چوڑا نالہ دوسری طرف پہاڑ تیسری طرف جہلم کی شاندار چھاؤنی اور سامنے

رہتاس کا خوبصورت قلعہ۔

ہم دیر تک وہیں بیٹھی ناپائداری دھر پر اشک حسرت بہاتی رہیں۔ چڑیلوں وغیرہ کا تو سامنا نہ ہوا البتہ باد تُند کے جھونکے جب جھروکوں سے ٹکراتے تو ایک نامعلوم مگر پرسوز نغمہ پیدا ہوتا جس سے عمارت کے درو دیوار گونج اٹھتے یہ سماں ہمیں کچھ ایسا بھایا کہ اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی ملتجیانہ انداز میں کہتا ہے کہ ایک لمحہ تو اور ٹھہرو۔ اس نامعلوم کشش نے ہمارے دلوں کو مسحور کر رکھا تھا۔

یکایک بستی کی طرف سے کچھ شور و غل کی آوازیں سناٹے کو توڑنے لگیں نزدیک آنے پر معلوم ہوا کہ ایک نحیف و کمزور ضعیفہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے آہستہ آہستہ لاٹھی ٹیکتی لڑکھڑاتی چلی آتی ہے اور اس کے پیچھے بستی کے آوارہ لونڈے تالیاں بجاتے "پگلی ریشمہ پگلی" کا غل مچاتے آتے ہیں۔

ضعیفہ کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ سانس پھولا ہوا تھا۔ پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔ کوئی دم میں گرا ہی چاہتی تھی۔ بار بار کھانسنے سے دمہ کی مریض ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اُس کا یہ حال ہم سے نہ دیکھا گیا۔ فوراً نیچے اتر کر اسی شکستہ سڑک پر آ گئے اور بمشکل اس کو ظالم بچوں کے چنگل سے چھڑایا۔

(۴)

پگلی میانہ قد کی گوری چٹی پاکیزہ صورت عورت تھی۔ گو کہن سالی نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ مگر خد و خال صاف کہہ رہے تھے کہ کسی زمانہ میں نہایت ہی حسین و جمیل ہوگی۔ بظاہر اُس میں دیوانہ پن کی کوئی علامت نہ تھی۔ وہ ایک پتھر پر بیٹھی میری طرف دیکھکر اظہارِ مسرت کے طور پر مسکرا رہی تھی اب اس کی حالت کچھ سنبھل چکی تھی۔

میں "بڑی بی مجھے آپ سے بڑی ہمدردی ہے اگر میری مدد کی آپکو ضرورت ہو تو میں بسر و چشم حاضر ہوں"۔

پگلی (جس کی آنکھوں میں اب آنسو بھر آئے تھے) "بیٹی خدا تجھے جزائے خیر دے۔ اگر تو وقت پر نہ آتی۔ تو خدا جانے میرا کیا حال ہوتا۔ میں پچھلے ہفتہ بخار میں مبتلا رہنے کی وجہ سے بہت کمزور ہو گئی ہوں۔ ان ناسمجھ بچّوں کو کیا خبر کوئی مرے یا جیئے۔ انکی بلا سے میں لاوارث ہوں اور قبرستان کے پچھواڑے کھنڈرات میں رہتی ہوں"۔

میں "اگر آپ اجازت دیں۔ تو ہم دونوں آپ کو وہاں تک پہنچا دیں"

پگلی نے میری طرف دیکھا۔ پھر آسمان کی طرف دیکھ کر زیر لب کچھ کہا اور ہمارے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئی۔

رضیہ (میرے کان میں آہستہ سے) "آپ تو بری طرح اس

بگلی کی گرویدہ ہوگئی ہیں۔ اگر یہ چڑیل ہوئی تو پھر؟

میں نے ہرچہ بادا باد کہتے ہوئے بگلی کو اٹھایا۔ وہ ہمارے بازوؤں کا سہارا لیتی ہوئی بیچدار راستوں اور پگڈنڈیوں میں سے گزرتی ہوئی ایک کھنڈر کے قریب آکر رک گئی۔

یہ تھا اس بگلی کا گھر جہاں زندگی کے آخری اور تکلیف دہ دن گذار رہی تھی دو کوٹھڑیوں کے آگے ایک چھوٹا سا صحن تھا۔ جس کی ایک دیوار منہدم ہو چکی تھی۔ اس نے ادھر گھاس پھوس کی دیوار بنا رکھی تھی یہ مکان کسی شاہی عمارت کا حصہ تھا۔ اس کا سامان بالکل مختصر تھا۔ صرف دو چار پائیاں ایک پھٹا ہوا پرانا بستر ایک بوریا اور چند مٹی کے برتن اسکی کائنات تھی۔ مگر سب چیزیں صاف ستھری تھیں صحن میں ایک طرف بکری بندھی ہوئی تھی جس کے دودھ پہ اس کا گزارا تھا۔ میں نے کچھ نقدی اس کے آگے رکھدی۔

بگلی (نقدی واپس کرکے) بیٹی خدا تمہارا بھلا کرے۔ میں تمہاری بہت ممنون ہوں۔ تم نے میرے لئے بہت تکلیف اٹھائی ہے مجھے نقدی کی ضرورت نہیں خدا نے مجھے ان سب چیزوں سے بے نیاز کر رکھا ہے میں صرف دودھ ہی پیتی ہوں سو میری بکری کا دودھ کافی سے زیادہ ہوتا ہے میرا بال بچہ تھوڑا ہی ہے۔ جس کے لئے روپے پیسے کی ضرورت ہو۔

میں۔ اس ویرانے میں آپ کی خبر گیری کون کرتا ہے۔
پگلی۔ ایک نیک عورت ہر صبح قبرستان آتی ہے اور میرے کام بھی کر جاتی ہے۔ جب کبھی وہ خود نہیں آتی تو اپنی لڑکی کو بھیج دیتی ہے آج تین چار دن سے وہ خود نہیں آئی۔ اس کی لڑکی کی زبانی معلوم ہوا۔ کہ وہ سخت بیمار ہے۔ میں اس کی عیادت کو قصبہ کی طرف گئی تھی۔ ورنہ ڈیڑھ دو سال سے میں کبھی قصبہ کی طرف نہیں گئی۔ پھر دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی کہ کب آئی ہو۔ کہاں ٹھہری ہو۔ کہاں سے آنا ہوا۔ میں اس کے ہر سوال کا جواب دیتی رہی۔ لیکن جب میں نے جہلم سے آنے کا حال بتایا تو پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ پھر ایک لمبا سانس لیا اور آبدیدہ ہو کر سر نیچا کر لیا۔ یکایک وہ کرب و اضطراب سے کراہنے لگی۔
میں ہمدردانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد۔ اس نے سر اٹھایا۔ تو اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ آنکھیں خون کبوتر ہو کر حلقوں سے باہر اُبلی پڑتی تھیں۔ منہ سے کف جاری تھا۔ مجھے مخاطب کر کے رعب دار آواز میں کہنے لگی۔
ظلم کی بیل کبھی منڈھے نہیں چڑھتی۔ ظالم کبھی پھولتا پھلتا نہیں دنیا دار المحن ہے۔ خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ وہ ضرور کئے کی سزا پائیگا۔"
گویا باتیں مجذوب کی بڑ سے زیادہ وقعت نہ رکھتی تھیں۔ مگر انسان کو

ان سے انکار نہیں ہو سکتا۔ میں اس کی ہاں میں ہاں ملاتی رہی۔ اس کی حالت دم بدم ابتر ہو رہی تھی۔ وہ یکایک اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں حیران تھی۔ کہ اس بڑھیا میں اتنا زور کہاں سے آگیا ہے۔ لنڈر جا کر وہ طاقچے سے ایک بٹوہ نکال لائی اور کہنے لگی۔

"لو یہ بتیس روپے ہیں جو ہاشم نے مجھے بطور حق مہر دئے تھے۔ یہ اُسے واپس دے دو۔ کیا ان چند ٹکوں سے اس ظلم و ستم کی تلافی ہو سکتی ہے جو اس نے مجھ بے زبان پر توڑے۔ اور کیا ان سے میری کھوئی ہوئی محبت واپس مل سکتی ہے۔ کیا ان سے میرا ٹوٹا ہوا دل جڑ سکتا ہے۔ کیا یہ میرے ناسوروں پر مرہم کا کام دے سکتے ہیں۔ کیا ان سے خوشی اور سکون خریدے جا سکتے ہیں؟ نہیں کبھی نہیں۔ میری فریاد عرش مُعلّیٰ میں شگاف کرتی ہوئی رب العزت کے حضور میں پہنچ چکی ہے۔ مظلوموں کا خدا اس پر ملائکہ مقربین سمیت لعنت کرتا ہے۔ عرش و کرسی، لوح و قلم تھر تھر کانپ رہے ہیں۔ ان چند ٹکوں کی ادائیگی پر وہ خدا کے سامنے سچا نہیں ہو سکتا۔ وہ خدا کو دھوکا دینا چاہتا تھا مگر خود ہی اس دھوکا میں گرفتار ہو گا۔ اس سے کہہ دو کہ اے انسان نما درندے میں اس عظیم الشان عدالت میں جس کے سامنے دنیا کی تمام عدالتیں ہیچ ہیں۔ انصاف کا دعویٰ کیا ہوا ہے۔ تو بدلے کے لئے تیار ہو جا اور آج سے

چالیسویں دن اسی بڑی عدالت میں حاضر ہو کر جواب وہی کرے۔"

میں اس پگلی سے اتنی مرعوب ہوئی کہ بغیر سوچے سمجھے بٹوہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ رضیہ ہر چند اشاروں سے منع کرتی رہی۔ مگر میں نے توجہ نہ دی۔ میں کسی نامعلوم طاقت کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنی ہوئی تھی۔ یکایک اُسے دمہ کا ایسا سخت دورہ پڑا کہ کھانستے کھانستے بیہوش ہو کر گر پڑی۔

ہم دونوں نے مل کر اس کو چارپائی پر لٹا دیا۔ جب کافی عرصہ کے بعد اس کو ہوش آیا۔ تو میں نے ہاشم کے متعلق دریافت کرنا چاہا۔ مگر وہ باوجود انتہائی کوشش کے کچھ نہ کہہ سکی۔ دورہ پھر شروع ہوا کھانستے کھانستے اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ چہرے پر مُردنی چھا گئی۔ یہ نظارہ میرے لئے سوہانِ رُوح تھا۔ میں بیدِ مجنوں کی طرح کانپنے لگی۔ اسی گھبراہٹ میں باہر کی طرف بھاگ کر دروازے تک پہنچ گئی۔ چاہتی تھی کہ بھاگ جاؤں۔ لیکن رضیہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

رضیہ (مجھے تسلّی دیتے ہوئے) بہن ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ مرنے سے کیا ڈرنا۔ یہ وقت ہر ذی رُوح پر آتا ہے۔ حوصلہ سے کام لینا چاہیئے! آخر وہ بھی ہماری طرح انسان ہے۔ اب ہمارا فرض ہے کہ اس کے منہ میں پانی ٹپکائیں۔ اور اس کے پاس کلمہ شریف پڑھیں۔" رضیہ ایسے بہت سے وقت گذار چکی تھی۔ اس کا دِل مضبوط ہو گیا تھا۔

مجھے بھی فوراً اس کی پیروی کرنی پڑی۔ ہم دونوں پانی کا پیالہ لئے کلمہ شہادت پڑھتی ہوئیں اس کی چارپائی کے قریب گئیں۔ مگر وہاں رکھا ہی کیا تھا۔ روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ ہم نے مرحومہ کے ہاتھ پاؤں سیدھے کئے۔ منہ کعبے کی طرف پھرایا۔ اور میت پر کپڑا ڈال کر "انا للہ وانا الیہ راجعون" کہتی ہوئیں باہر نکل آئیں۔

جب ہم گرتی پڑتیں جائے رہائش پر پہنچیں تو دن ڈھل چکا تھا۔ والدہ محترمہ کو بہت تشویش تھی۔ آتے ہی سوالوں کی بوچھار کر دی۔ مگر ہم نے بائیں شائیں کر کے ان کو ٹال دیا گیا۔ میرا دل کچھ اتنا متاثر ہو چکا تھا کہ بغیر کچھ کھائے پئے سو گئی۔ اب مجھے رہنا اس کی کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ چنانچہ ہم لوگ دوسرے دن ہی واپس آ گئے۔ اور واقعہ سب کے سامنے بیان کیا۔ مگر سوائے حیرت کے کوئی بھی اس کے متعلق کچھ رائے قائم نہ کر سکا۔

(۵)

رات کا وقت تھا۔ بارش بڑے زور شور سے ہو رہی تھی۔ کبھی اولے پڑتے۔ کبھی موسلا دھار پانی پڑتا۔ رعد کی گرج سے کانوں کے پردے پھٹے پڑتے تھے۔ بجلی کی چمک سے کمروں کے اندر آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ طوفان کا وہ زور تھا کہ الاماں درخت جڑوں سے اکھڑ رہے

تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ قیامت کا دیوتا اپنی تمام قوتوں کے ساتھ دنیا والوں سے آمادۂ جنگ ہے یہ رات ایسی ہولناک تھی کہ خدا پھر کبھی نہ دکھلائے۔ ہم لوگ سہمے ہوئے اپنے بستروں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کہ اچانک ہماری خواب گاہ کے پچھواڑے والا دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔ "ایں اس وقت دستک دینے والا کون ہے"۔ سب نے تعجب سے کہا۔

میں نے اپنی ملازمہ سے "مرجان جاکر دریافت کرو۔ کون ہے"۔

مرجان۔ بیچاری ہچکچاتی ہوئی گئی۔ اور آنے والے کا نام سُن کر ایک دم اچھل پڑی جیسے کسی سانپ نے کاٹا ہو۔ اگر دیوار کا سہارا نہ ہوتا تو ضرور گر پڑتی۔

ہم لوگ حیران تھے کہ اس کو کیا ہوا۔ کھٹا کھٹ پھر آواز آئی۔

میں۔ مرجان کون آیا ہے۔ مگر صدائے برنخواست اری مرجان تو بتاتی کیوں نہیں"۔ میں نے زور سے کہا۔

مرجان (لڑکھڑاتی زبان سے) ہا....... ہا..... شم۔

سب کی زبان سے یک دم نکلا "ہاشم"! اور کلیجے دھک سے رہ گئے۔ بچے چیخیں مار کر رونے لگے۔ مجھ پر ایسی ہیبت چھائی۔ کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

میں "الٰہی آج کیا ہونے والا ہے۔ ایسے وقت میں آنیوالا ہاشم

خدا جانے کیسا مہیب اور ڈراؤنا ہوگا۔"

دروازہ برابر کھٹکھٹایا جا رہا تھا۔ ہمارے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو رہے تھے۔ آخر میرے شوہر نے کہا " اجی کیا اندھیر ہے۔ وہ بھی تو انسان ہی ہوگا۔ کوئی ہوّا تو نہیں "۔ یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھے ہم لوگوں نے شدتِ خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ دروازہ کھول دیا گیا۔ وہ ہنس کر کہنے لگے " لو جی! جس سے ڈرتے تھے۔ وہ تو گھر کا ہی آدمی نکلا"۔ اور ساتھ ہی ہمارا بوڑھا خانساماں چھٹن ہانپتا کانپتا اندر آ گیا۔

میں " کیوں خانساماں تمہیں کیا ہوا؟"

خانساماں " آہ! بیگم صاحبہ میں وہی بدنصیب ہاشم ہوں جس کی بیوی کا قصہ چالیس روز ہوئے۔ آپ نے بیان کیا تھا"

ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ چھٹن ہی ہاشم ہوگا۔ اس نے اپنی کہانی اس طرح بیان کی۔

چھٹن " میں یو۔ پی کا نہیں۔ بلکہ ضلع جالندھر کا رہنے والا ہوں حسین و جمیل رشیدہ میرے سگے چچا کی اکلوتی لڑکی اور میری منکوحہ تھی۔ والدین کا سایہ بچپن ہی سے میرے سر سے اٹھ گیا تھا۔ اس لئے چچا ہی کے پاس رہنے لگا۔ میرا چچا اچھا خاصہ زمیندار تھا۔ میں چونکہ لاڈ پیار کی وجہ سے آوارہ ہوگیا تھا۔ اس لئے کوئی ہنر نہ سیکھ سکا۔ چچا کی

وفات کے بعد مجھے کمانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ایک خانساماں سے چچا کی جان پہچان تھی۔ اس نے مجھے کچھ عرصہ کام سکھا کر ایک صاحب کے ہاں ملازم کرا دیا۔ اب مجھے تنخواہ بھی اچھی ملنے لگی۔ اور بد دیانتی سے بھی کافی روپیہ پیدا کرنے لگا۔ تین چار سال تک تو مجھے ریشمہ سے بڑی محبت رہی۔ مگر جب ننھا قاسم پیدا ہوا۔ میری طبیعت خود بخود اس سے ہٹ گئی۔

حالانکہ پاکباز ریشمہ بدستور مجھ سے محبت کرتی رہی۔ بالآخر میری آوارگی رنگ لائی۔ جو کچھ کماتا۔ اس سے دُگنا عیاشیوں پر خرچ کر ڈالتا۔ اس لئے مقروض ہو گیا۔ ریشمہ اپنی نقدی اور زیور وغیرہ بھی میرے حوالہ کر چکی تھی۔ اب میں چاہتا تھا کہ چچا کی زمین پر بھی ہاتھ صاف کر دوں۔ مگر چچی کی زندگی میں یہ ناممکن تھا۔ وہ ابھی اتنی بوڑھی بھی نہ تھی۔ کہ اُس کے مرنے کی امید ہوتی۔ میں اسی فکر میں رہنے لگا۔ کہ کسی طرح اس کو ٹھکانے لگاؤں۔ چنانچہ انہی دنوں وہ ملیریا میں مبتلا ہو گئی۔ ایک دن . . .

موقعہ پا کر میں نے اس کی دوائی میں زہر ملا دیا جس سے وہ بے چاری جان بحق ہو گئی۔ اور میری سیہ کاری پر پردہ پڑا رہا۔ اب میں آزاد تھا۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔ چچا کی زمین کا چلتا دھندا کیا۔ کچھ عرصہ بعد ہمارے صاحب کا تبادلہ جہلم چھاؤنی میں ہو گیا۔

میں بھی ریشمہ کو لے کر جہلم چلا آیا۔ یہاں ہماری میم صاحبہ کے

پاس ایک نئی آیا ملازم ہوئی۔ جو اتنی خوبصورت نہ تھی۔ مگر بڑی عیاش اور نٹ کھٹ عورت تھی۔

میں اس پر ریجھ گیا۔ اور میری اس کی آشنائی ہو گئی۔ میں اکثر آدھی آدھی رات تک آیا کے پاس ہی رہتا۔ وہ بھی اکثر میرے گھر آیا جایا کرتی تھی۔ میں ریشمہ کے سامنے ہی اس سے اظہار محبت کرتا۔ اب میں ریشمہ سے بالکل متنفر ہو چکا تھا۔ روز بروز اس سے سختی سے پیش آتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کڑھتی۔ مگر منہ سے اف تک نہ کرتی تھی۔ اس کی امیدوں اور خوشیوں کا مرکز اب صرف ننھا قاسم تھا۔ اب وہ چار برس کا تھا۔ اور اپنی محبت بھری معصومانہ باتوں سے اُس کا دل بہلاتا تھا"

جاڑے کے دن تھے۔ قاسم کا کوئی گرم کپڑا نہ تھا۔ وہ ٹھنڈے پہروں میں صحن کی مرطوب زمین پر کھیلتا رہا۔ نتیجہ یہ کہ وہ بخار اور نمونیہ میں مبتلا ہو گیا۔ میں نے اس کا کچھ علاج نہ کیا۔ ریشمہ مہترانی کی منت کرتی تو وہ اس کو ہسپتال سے دوائی لا کر دے جاتی بچے کی بیماری کو چھ دن گزر چکے تھے۔ میں رات کے بارہ بجے اپنی محبوبۂ دلنواز کی نازبرداریوں سے فارغ ہو کر گھر پہنچا۔ دروازہ پر دستک دی تو ریشمہ نے خلافِ معمول بڑی دیر کے بعد دروازہ کھولا مجھے اس حرکت پر بڑا غصہ آیا اندر جا کر اس کو بہت مغلظات سنائیں۔ وہ بے چاری بے لبس تھی۔

ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ پھر میں آگ بگولا ہو گیا۔ لاتوں اور گھونسوں سے خوب زدوکوب کیا اور اسی وقت گھر سے نکل جانے کا حکم دیا۔ اس پر وہ بولی۔ .... دیکھ اتنا ظلم نہ کر۔ خدا سے ڈر۔ میرا بچہ دم توڑ رہا ہے میں خود بھی بخار میں پھنکی جا رہی ہوں۔ مجھ پر رحم کر۔ آخر تمہاری بیاہتا بیوی ہوں۔ میرا بھی تم پر حق ہے۔ میں کیوں جاؤں؟"

میں نے یہ الفاظ اس کی زبان سے کاہے کو سنے تھے۔ مجھے بڑا طیش آیا۔ کہ اب یہ اپنا حق جتاتی ہے۔ میں نے تیس روپے نکال کر اس کے پلے باندھ دیئے۔ کہ لے اپنا حق جس پر تو اتنا اتراتی ہے۔ اور کوئی دم کا مہمان بچہ اس کی گود میں دے کر دھکے دے کر باہر نکال دیا۔"

دوسرے دن شہر جانے پر پتہ چلا۔ کہ صبح دریا کے کنارے ایک عورت چار پانچ سالہ بچے سمیت سردی سے اکڑی ہوئی بے ہوش پائی گئی۔ جسے فوراً ہسپتال پہنچایا گیا۔ بچہ مر چکا ہے۔ اور عورت قریب المرگ ہے میں خوش تھا۔ کہ دونوں سے پیچھا چھوٹا۔ اب ہر وقت آپا کے ساتھ رنگ رلیوں میں مصروف رہنے لگا۔

"آخر ایک دن میرا اور آپا کا تعلق طشت از بام ہو گیا۔ دونوں بڑی ذلت اور رسوائی کے ساتھ برطرف کئے گئے۔ آپا اپنے وطن لکھنو چلی گئی۔ میں اس کے پیچھے گیا۔ مگر وہ مجھ سے اب سیدھے منہ بات بھی نہ

کرتی تھی۔ کیونکہ اب میں بالکل قلاش تھا۔ میں نے اپنا نام بدل کر چھیٹن رکھ لیا۔ اور بیس سال تک لکھنؤ میں قلیل مشقت کر کے پیٹ پالتا رہا آخر ایک پنجابی ڈاکٹر صاحب کے ہاں جو وہاں تبدیل ہو گئے تھے۔ ملازم ہوا۔ اور انہی کے ساتھ دوبارہ پنجاب میں آیا۔"

جُوں جُوں وہ واقعہ بیان کرتا جاتا تھا۔ اس کی حالت بگڑتی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ ہذیان بکنے لگا۔ اُس کا بدن بخار سے پھنک رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔ اِدھر اُدھر سر پٹکتا تھا۔ اور مجھے "بچاؤ بچاؤ" کہہ کر جگر خراش چیخیں مارتا۔ کبھی کہتا ہائے چچی حفیظ گرم سلاخوں سے میرا بدن داغ رہی ہے۔ کبھی کہتا رشیمہ مجھے آتشیں بھالا نہ مارو۔ ہائے مجھے دوزخ کے فرشتے پابجولاں کر کے لے چلے ہیں۔ مجھے چھڑاؤ۔"

غرضکہ اسی طرح چیختا چلاتا صبح کے وقت مر گیا۔ ادھر طوفان بھی تھم گیا تھا۔ صبح سویرے ہی اس کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا گیا۔ جب جنازہ تیار ہوا۔ تو میں نے وہ بٹوہ جو جگنی نے دیا تھا۔ کفن کے اندر رکھوا دیا۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

ایم - ظہیر صاحب مالک اُردو بک سٹال بیرون لوہاری دروازہ لاہور نے [illegible] پریس لاہور میں باہتمام [illegible]